جرمِ اُلفت کے اسیر

فرحین اظفر

جرسِ الفت کے اسیر

فرحین اظفر

امی کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑ رہے تھے۔ سامنے میز پر رکھی چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ سے پرے ان کا سنجیدہ چہرہ ان دعاؤں کے ردِعمل میں مزید سنجیدہ ہو چلا تھا۔

روبیشہ نے جھکی، جھکی نظروں سے سامنے بیٹھے زین العابدین کو دیکھا اور سر بھی جھکا لیا۔ وہ زیادہ دیر بیٹھنے نہیں آیا تھا۔ پوری چائے بھی نہیں پی اور اٹھ گیا۔

''ربا تم!'' دروازے سے نکلتے سے ذرا کی ذرا تھم کر اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''شاپنگ کرنے چلو گی میرے ساتھ؟'' اس کی

بات کس قدر غیر متوقع تھی وہ خود بھی جانتا تھا، روبیشہ کے چہرے پر اُمڈتی حیرت سے قطع نظر وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

''آں...... امی سے پوچھ کے......''

فوری طور پر جواب بھی نہ سوجھا اور مزید گڑبڑاہٹ یمنیٰ کی بے وقت انٹری نے پیدا کردی۔ وہ عین سامنے رکشا سے اتری تھی۔ زین العابدین رکا نہیں۔ سلام کر کے سیدھا نکلتا چلا گیا۔

''کیوں آیا تھا یہ اب یہاں پر......؟'' یمنیٰ کا انداز جارحانہ سا تھا۔

''یمنیٰ!'' اس نے حیرت سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا۔

''کارڈ دینے آئے تھے اپنی شادی کا۔'' بولتے ہوئے اس کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ یمنیٰ کے لب فوری طور پر بھینچ سے گئے۔ وہ تیزی سے امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

لاؤنج سے کسی مہمان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب سے نمایاں آواز بلاشبہ ہانیہ کی تھی۔

اس کے ماتھے پر ہلکی سی شکن نمودار ہوگئی۔ بے حد سنجیدہ شکل کے ساتھ اس نے لاؤنج میں قدم رکھ کر زوردار آواز میں سلام کیا۔ ملی جلی آوازوں میں جواب موصول ہوا۔

''امی بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پلیز کھانا میرے کمرے میں بھجوادیں۔'' بنا کسی کی طرف دیکھے وہ سیدھا اندر بڑھ جانا چاہتا تھا۔

''ارے ایسے کیسے بھئی، رکو تو...... یہاں سب تمہارے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔'' اس نے کوفت سے امی کا پیغام سنا۔

''کیوں، میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا تو میں برا مان جاؤں گا۔'' لاؤنج کے کونے سے ابھرتی دبی، دبی ہنسی کی آواز نے اس کی بیزاری بڑھائی۔

''اچھا، اچھا...... زیادہ اتراؤ نہیں، جاؤ جا کے جلدی سے کپڑے بدل کے آؤ۔ تمہاری پسند کا ہری مرچ کا پلاؤ بنایا ہے۔'' امی نے پیار سے پچکارا مگر اپنی مرضی اور پسند کے کھانے کی خوش خبری بھی اس کا موڈ بحال نہ کرسکی۔

ڈائننگ ٹیبل پر حسب توقع صرف دو وجود اس کے منتظر تھے۔ ہانیہ اور اس کی اکلوتی چھوٹی بہن شاہ نور...... برابر، برابر کی کرسیوں پر ایک دوسرے سے جڑی۔ پہلے کھسر پھسر ہو رہی تھی......

''امی تو کہہ رہی تھیں کسی نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔'' اس سے کہے بغیر رہا نہیں گیا۔

''ہاں تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ صرف امی نے خود ہی کھایا ہے اور کسی نے تو بہت انتظار بھی کیا۔'' شاہ نور نے کسی پر خاص دباؤ ڈالا۔ اس کا دل چاہا اپنی ہی بہن کا گلا دبا دے۔

''امی سے کہہ دینا آئندہ کسی کو میرے لیے انتظار کی تکلیف نہ دیں۔'' اس کے سرد لہجے کی تلخی ہانیہ کے سامنے رکھی پلیٹ میں آن گری۔

☆☆☆

''امی! زین شاپنگ کا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے موبائل لا کر جھکی نظروں سے امی کی طرف بڑھا دیا۔ پاس بیٹھی یمنیٰ جو رازداری سے امی سے جانے کون سی بات کر رہی تھی تلملا کر پہلو بدل گئی۔

امی فون پر بات کر چکیں تو اس نے سیل فون واپس لیتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ یمنیٰ پر ڈالی۔ وہ شرر بار نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا اس کا وجود بھسم ہو جائے گا۔

''اب کیا ضرورت ہے اسے، یہ چونچلے دکھانے کی۔'' اس سے بالآخر رہا نہیں گیا۔

''کوئی ضرورت کیوں نہیں۔ اس کی کون سی دس بہنیں ہیں۔ اور یہاں کون سا کوئی بھائی ہے جو......'' امی اپنی سادگی میں کہے جا رہی تھیں۔

''افوہ امی، کس دنیا میں رہتی ہیں آپ۔ اچھی طرح جانتی ہیں آپ کہ زین کا جھکاؤ روبیشہ کی طرف کیوں تھا۔ وہ پسند کرتا تھا اسے۔ پھر اب یہ بہن بھائی کا رشتہ کہاں سے آ گیا؟'' اس کے قدم دہلیز پر جم گئے۔

''تو شادی ہوئی تو نہیں ناں! بلکہ شادی تو دور کی بات.... رشتہ تک نہیں آیا اور......'' وہ چپ چاپ بڑھ گئی۔
''تم اپنی بہن کو جانتی ہو وہ اس طرح کی باتوں میں کہاں ہے۔'' امی کی دور ہوتی آواز میں ماؤں والا مخصوص فخر تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل انجانے ملال میں گھر گیا۔

ہے کہیں کوئی وکیلِ باکمال ایسا
میرا ہارا ہوا عشق جتا دے مجھ کو

☆☆☆

''آپ کو نہیں لگتا، مجھے اس طرح شاپنگ پر لے جانا ٹھیک نہیں؟'' فرنٹ سیٹ پر براجمان بھاگتے دوڑتے مناظر پر نگاہیں ٹک نہیں رہی تھیں۔ جبھی اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
''کیوں، کسی نے کچھ کہا تمہیں؟'' زین کا چونکنا بڑا فطری سا تھا۔
''نہیں بس ایسے ہی..... پہلے ہی خاندان میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ آپ.....'' وہ ایک دم جھجک کر چپ ہوگئی۔ پہاڑ جیسی بات میں رائی برابر سچ کا امکان تو بہر حال تھا۔
''ہاں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا ماضی میں اگر کوئی ارادہ تھا بھی تو اپنوں کی مہربانی سے پورا نہیں ہوسکا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب میں تم سے بات بھی نہیں کرسکتا۔''
''بات کرنا اور بات ہے اور اس طرح شاپنگ کے لیے.....'' اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔
''کیوں، اس میں کیا برائی ہے؟''
''میرے اور آپ کے نزدیک نہ بھی ہو..... لیکن اور دوسرے لوگ تو......''
''تم ان کی پروا کرتی ہو یا میری؟'' زین کا انداز سنجیدہ تھا۔
''آپ کی بھی کرتی ہوں۔''
''بھی سے مطلب؟''
''اُف..... !'' وہ زچ ہوگئی۔ ''آپ جانتے ہیں۔ میں کس بارے میں بات کررہی ہوں۔''
''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ بات تم سے کسی اور نے کی ہے اور تم مجبور ہوکر مجھ سے کہہ رہی ہو۔ نہ یہ بات تمہاری ہے۔ نہ الفاظ تمہارے ہیں۔'' اس کے دوٹوک لہجے کے آگے ٹھہرنا رومیشہ کے لیے ہمیشہ ہی مشکل ہوتا تھا۔
''جب پتا ہے تو مجھے تنگ کرنے کا مطلب۔'' چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ تنک ہی گئی۔ زین اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

☆☆☆

شام کے سائے تھک کر اندھیروں میں مدغم ہو رہے تھے۔ شاہ نور کے کمرے سے آتی ہانیہ کی باتوں کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی تک یہیں ہے۔ اور اب رات ہوجانے کا مطلب بھی ظاہر تھا کہ اسے ڈراپ کرنے کی ذمے داری اسی کو نبھانی تھی۔
''اٹھ گئے تم بلال؟'' سوچ کچھ ڈرامے کے ہر ایکٹ پر، پرفارم کرنے کے لیے امی برآمد ہوئیں۔
''ظاہر ہے جبھی نظر آرہا ہوں۔'' بظاہر اس نے بہت آرام سے کہا تھا۔
وہ بڑے محظوظ انداز میں ہنسیں۔
''اچھا شام کی چائے تو تم نے پی ہی نہیں تھی۔ فریش ہوکر چائے پیو..... پھر......''
''میں کسی کو ڈراپ کرنے نہیں جاؤں گا۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹی اور دو قدم پیچھے ہٹا۔
''ارے ارے سنو تو..... وہ ہانیہ......''
''نو امی..... پلیز نہیں، وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ قدم، قدم پیچھے سرکتا واپس کمرے میں بند ہوجاتا۔
''بابا گھر آچکے ہیں۔'' امی نے ممکنہ خطرے کو بھانپ کر فوری حد بندی کی۔ بلال کے ہاتھ بے جان انداز میں لٹک گئے۔ وہ ہتھیار ڈال ہی دیتا مگر شاہ نور کے کمرے سے نکلتی ہانیہ نے جس انداز میں اسے دیکھا تھا، اسے پتنگے لگ گئے۔

"امی، بابا سے کہہ دیجیے گا کہ میں کسی کا ڈرائیور نہیں ہوں۔" اس نے فی الفور کمرے میں گھس کر دروازہ دے مارا۔ ہانیہ کے چہرے پر تیرتی مسکراہٹ ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

خواب بند آنکھوں سے دیکھے جائیں تو آنکھیں کھلتے ہی غائب ہو جاتے ہیں کبھی آنکھوں سے اور کبھی، کبھی دماغ سے بھی...... وہ خواب جو کھلی آنکھوں سے دیکھا گیا ہو۔ دن رات جسم و جاں کی تمام شدتیں صرف کر کے سینچا گیا ہو۔ خاموش تمناؤں کے پھولوں سے جس کی آرائش کی گئی ہو۔ جس کی تاباں جھلملاہٹ، حقیقت کی تیز روشنی کو چندھیا دے...... اس خواب کو کوئی کیسے توڑے، کیسے چھوڑے۔ جو جاگتی آنکھوں بقائمی ہوش و حواس کے ساتھ دیکھا جائے، وہ تو آنکھیں بند کر کے اور بھی واضح ہو جاتا ہے، نہ جان چھوڑتا ہے نہ دل سے نکلتا ہے۔ نہ دم توڑتا ہے۔

اس نے بے اختیار بریک لگائے۔ گاڑی جھٹکا کھا کر بیچ سڑک پر رکی تھی۔

سامنے سے گزرتا ایک کم سن گجرے بیچتا بچہ زد میں آنے سے بچ کر بھاگا اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اس کی مٹھی میں دبی ہموار، گول چکنی ڈنڈی میں قطار سے سجے دودھیا گجرے زین کی نگاہوں کا مرکز بن گئے اور دھیان کسی کی مرمریں کلائیوں میں جکڑا گیا۔

شہر کی مصروف شاہراہ پر بے تکے انداز میں بج اٹھنے والے بھونڈے، بے سُرے ہارن کی آوازوں نے اس کے حواس جگائے تو اس نے گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ہی لگا دی۔

گجرے بیچتا بچہ چمکدار آنکھوں سے ہاتھ میں دبے سرخ نوٹ کو دیکھ رہا تھا۔ صرف دو کنگنوں کی اتنی قیمت آج سے پہلے کسی خریدار نے نہیں لگائی تھی۔ یہ اس کی صرف آج کی نہیں۔ پوری زندگی کی یادگار کمائی تھی۔ وہ دیر تک سیاہ رنگ کی اس لمبی سی گاڑی کو دیکھے گیا۔ جس کے ڈیش بورڈ پر تازہ موتیے کے کنگن پڑے تھے۔

گاڑی جانے پہچانے راستوں کی طرف مڑ چکی تھی۔ وہی خواب جو پچھلے کئی سال سے بڑی پابندی اور وقت اور موقع محل کی تمیز کے بغیر دیکھا گیا تھا۔ وہی خواب اس کا ہاتھ تھامے کشاں، کشاں اس مانوس دہلیز تک گھسیٹ لایا تھا۔

لاؤنج میں بالکل سامنے یمنیٰ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ زین کے گمان میں دور، دور تک یہ بات نہ تھی کہ وہ اس وقت یہاں موجود ہو سکتی ہے۔ ایک لمحہ ٹھٹک کر اس نے قدرے بلند آواز میں سلام کیا۔ بہرحال اندر تو وہ آ ہی چکا تھا اور روبیشہ اسے دیکھ بھی چکی تھی جو، کچن سے باہر نکلی تھی۔

"ارے آپ، اپنے مایوں کے دن بھی چین نہیں آپ کو۔" زین نے ہمیشہ والی بے تکلفی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا شاپر فریزر کھول کر اندر رکھ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ فریج سے پانی کی بوتل بھی نکال لی۔

"امی سو رہی ہیں۔ اب اٹھنے والی ہوں گی۔ فجر سے اٹھی ہوئی تھیں پھر نو بجے ہی آنکھ لگی۔" اسے کانچ کا گلاس پکڑاتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے بار، بار یمنیٰ کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے سلام کے جواب میں مڑ کر ایک نظر تک اس پر نہیں ڈالی تھی۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے یا ٹھنڈا......؟" وہ بولتے، بولتے رک گئی۔ زین اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"تم روئی ہو رُبا......؟" اس نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بولتے، بولتے رک گئی۔ وہ ہنوز اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یمنیٰ نے خاموشی پر مڑ کر انہیں دیکھا اور ساکت ہو گئی۔

چند خاموش لمحات محبت ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ روبیشہ اس کے لب دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھیں اور یمنیٰ ان کی محویت پر منجمد تھی۔ پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ نہ انکار کیا نہ اقرار مگر وہ

جواب لے چکا تھا۔

"اتنے انمول موتی یوں رد لنے کے لیے نہیں ہیں رد بیشہ۔ انہیں کسی خوشی کے وقت کے لیے سنبھال کر رکھو۔" وہ بولتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگا گیا۔

"آئس کریم لایا ہوں، فریزر میں رکھی ہے۔"

اس کا انداز ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔

"اوہ، کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھی آپ نے صرف پانی لیا ہے۔" اس نے بھی خود کو بروقت سنبھالا۔

"صرف پانی ہی تو لیا ہے۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

"اور ضرورت کیوں نہیں تھی۔ میرا دل چاہا میں لے آیا۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" آخر میں وہ کچھ جتا کر بولا۔ جانتا تھا یمنیٰ جو واپس ٹی وی کی طرف مڑ چکی ہے۔ ان ہی کو سن رہی ہے۔ بغور..... پورے دھیان سے۔

"نہیں بھئی، مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔" رد بیشہ ہلکے سے ہنس دی۔

"خیر تم کیا کوئی بھی اور..... کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ نہ میرے یہاں آنے پر نہ کچھ لانے پر۔ یہ میرے چچا کا گھر ہے۔ جب جی کرے گا آؤں گا اور جو دل کرے گا لاؤں گا۔ اور یہیں بیٹھ کر کھاؤں گا۔" یمنیٰ نے ریموٹ پٹخا اور اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"اور دشمنوں کا دل جلاؤں گا۔" آخری جملہ اس نے دھیرے سے رد بیشہ کی طرف جھک کر کہا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی نکل گئی۔ زین ایک لمحے کے لیے کھو سا گیا۔

"وہ میرے دشمن نہیں، میرے اپنے ہیں۔"

"اپنے ہیں مگر خیر خواہ نہیں تو کیا فائدہ۔"

رُبا جانتی تھی اسے امی یا یمنیٰ سے کوئی شکایت نہیں۔

"وہ نہیں تو کیا ہوا۔ اللہ تو ہے خیر خواہ۔" رُبا نے مسکراتے ہوئے آنکھوں کی نمی صاف کی۔ زین گہری سانس بھر کر سنجیدگی سے سر جھکا گیا۔ چند لمحے خاموشی دونوں کے مغموم چہرے تکتی رہی۔ جہاں زیست کا سب سے انمول خزانہ چھن جانے کا پہاڑ جتنا بڑا دکھ رقم تھا۔

"چلتا ہوں، چچی کو سلام کہنا۔"

رُبا کچھ کہنا چاہتی تھی۔ جبھی اندر سے ایک نامانوس سی چیختی ہوئی آواز آئی۔

زین ایک دم چونک سا گیا۔

"طبیعت کیسی ہے اب اس کی؟"

"بہتر ہے۔" رُبا سر جھکا کر رنجیدگی سے بولی۔

اس کے چہرے پر چھائے اداسی کے معمولی سے سائے بھی زین کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھے۔

"آج کسی وقت یا کل اس کی دوائیں دے جاؤں گا۔" اس نے بولتے ہوئے قدم بڑھائے۔

"فی الحال ضرورت نہیں، میں نے منگوالی تھیں۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یک دم پلٹا۔

"کیوں.....؟" اس کی آواز میں قدرے خفگی جھلک آئی۔

"سوری!" رُبا جیسے اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ "میں نے سوچا شادی کی وجہ سے آپ مصروف ہوں گے تو....." اس کی نگاہیں نیچی تھیں۔

"تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارے لیے میں ہر مصروفیت کو پسِ پشت ڈال سکتا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ آزمانے کی۔" اس نے یونہی جھکی نگاہوں سے دھیرے سے بول کر دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا۔

نارسائی کے چند دکھ بھرے لمحوں نے بیچ میں کمند ڈالی۔ زین کی غلافی آنکھوں نے چپکے سے دہلیز پر سمٹی ہجر کی تپتی دوپہر کو دیکھا اور پیچھے مڑ گیا۔

"شام میں آنا ضرور..... میں انتظار کروں گا۔"

وہ اس کی پشت دیکھتی رہی۔ یہ تک نہیں کہہ سکی کہ اپنے مایوں کی رسم میں نکاح کے وقت، بجائے شریکِ حیات کے کسی اور کا انتظار چہ معنی..... وہ اس سے پوچھ بھی لیتی مگر ڈیش بورڈ پر مہکتے گجروں سے نگاہ ہٹا پاتی تب، گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور منظر اس کی نگاہوں میں نقش ہو گیا۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹیبل پر امی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے شدت سے یہ بات محسوس کی۔

''بابا کہاں ہیں امی؟''

''ابھی سو رہے ہیں۔'' وہ سنجیدہ سی تھیں۔

''خیریت، آفس نہیں جانا'' اس کے ہاتھ رک گئے۔

''جائیں گے، رات ذرا سر میں درد تھا تو......''

''لو مجھے بتایا نہیں آپ نے، میں رات کو ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔''

''ارے نہیں۔'' امی بات کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے ذرا سا مسکرائیں۔

''اتنا زیادہ نہیں تھا اور ویسے بھی تم تو مغرب کے بعد سے ہی کمرے میں بند تھے۔''

انہوں نے کچھ جتایا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ خفیف سا ہو گیا۔

''تمہارے بابا کہہ رہے تھے۔ بلال کو ایسے... بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ خود گئے تھے ہانیہ کو چھوڑنے۔ شاید وہیں سے واپسی پر انہیں درد شروع ہو گیا تھا۔ رات میں ڈرائیونگ آئی سائٹ پر افیکٹ کرتی ہے ناں۔'' ان کا لہجہ اب بھی سادہ تھا مگر وہ شرمندہ ہو گیا۔

''سوری امی! میں بابا سے ایکسکیوز کر لوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ وہ کوئی ناراض تھوڑی ہیں۔''

''پھر بھی......''

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا مگر بے حد فرمانبردار بیٹا تھا۔ زندگی میں شاید ہی اس نے کسی معاملے میں ماں باپ کی خواہش پر اپنی مرضی کو ترجیح دی ہو۔

ریحان سعدی اور بیگم آمنہ ریحان اس معاملے میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے تھے۔ شاہ نور اور بلال ان کے دونوں ہی بچے بہت سعادت مند تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بہت دھیان اور احتیاط سے کی تھی۔ ان کی محنت اور دیکھ بھال کا ہی نتیجہ تھا کہ دونوں بچے خاندان میں ممتاز حیثیت سے جانے اور مانے جاتے تھے۔ تعلیم کے میدان میں بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ شاہ نور میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ بلال بی اے کر رہا تھا اور فائنل سمسٹر سے فارغ ہوا ہی چاہتا تھا۔

☆☆☆

روبیشہ مایوں کی تقریب میں نہیں جا سکی۔ صبغہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آج ہی زین کے نکاح کی رسم بھی ادا ہونے والی تھی۔

صبغہ مسلسل ایک ہفتے سے کھانس رہی تھی۔ ساری دوائیں بدلتے موسم کی شدت کے آگے بے اثر ہو چکی تھیں۔ اس کا بہانہ رُبا کو وہاں جانے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔ یمنیٰ جو صبح سے امی کے یہاں آ کر رکی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ سن کر بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس خارج کر بیٹھی۔

روبیشہ نے اس کے اطمینان کو بہت محسوس کیا اور اس کی احتیاط پسند طبیعت کی بے عقلی پر دل ہی دل میں ہنس دی۔

آج زین ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے والا تھا۔ اس کے بعد بھی، اس کی زندگی کسی اور کی امانت ہو جانے کے بعد بھی اگر یمنیٰ کو اس کی طرف سے کسی قسم کی خیانت کے خدشات لاحق تھے تو روبیشہ اس کی ذہنیت پر افسوس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یمنیٰ جو بچپن سے زین کو جانتی تھی اور جو یہ بھی جانتی تھی کہ وہ وعدہ خلاف ہے نہ جھوٹا اور نہ خائن۔

بہت کم سنی میں اس نے کبھی خود سے اور روبیشہ سے اس کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت جب اس کی جڑواں بہن صبغہ اپنی کمزوری کی وجہ سے سیڑھیوں پر لڑکھڑائی تھی اور اسے بچانے کے چکر میں روبیشہ لڑھکتی ہوئی پہلی سیڑھی سے آخری قدمچے تک جا پہنچی تھی۔ اس وقت روبیشہ اور زین کے والد ایک ہی گھر میں رہائش پزیر تھے اور دادی حیات تھیں۔ تب انہوں نے ایک دھموکا زین کی کمر پر جڑ دیا تھا۔

''اور تو اتنا بڑا ہو کر بھی گھوڑوں کی طرح ویکھتا رہا۔ یہ نہیں کہ جلدی سے اٹھا لیتا کتنا خون بہہ گیا بچی کا۔''

''ارے اماں جی، اب اتنا بڑا ابھی نہیں...... بچہ

ہی ہے۔'' بڑی ای کو شاید اسی دن سے رو بیشہ کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ جس دن سے زین کے دل میں اس کی کوئی خاص جگہ مقرر ہوئی تھی۔

''کون سا وہ جا کر اس کا بہنے والا خون روک لیتا۔'' سب کی فکروں سے بے نیاز ان کی بڑبڑاہٹ دیر تک جاری رہی۔

تب سے اب اور آج تک...... جبکہ رو بیشہ کے بجائے کوئی اور اس کی شریکِ حیات بننے جارہی تھی۔ زین نے خود سے اور رو بیشہ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا تھا۔ صرف یہی نہیں سارا گھر بلکہ سارا خاندان اس بات کا گواہ تھا۔ زین کی جان گویا رُبا میں بند تھی۔ اس کی خوشی، زین کی خوشی تھی اور اس کے آنسو، زین کی تکلیف۔ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر گام پر، ہر جگہ زین نے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح رو بیشہ کو سنبھالا تھا۔ کبھی کوئی غلط نگاہ اور بری نیت اس پر پڑنے نہیں دی تھی۔

از خود سب کے یہ فرض کر لینے کے باوجود، زین شادی کی عمر کو پہنچے گا تو یقیناً رو بیشہ کے سوا کوئی اس کا انتخاب نہ ہوگا۔ زین نے کبھی مستقبل کے حوالے سے رو بیشہ کو کوئی خواب نہیں دکھائے تھے، باقاعدہ پرپوز نہیں کیا۔ کبھی آئی لو یو نہیں کہا...... تو کیا اس سب کے بعد بھی کسی کے دل میں اب اس کے لیے کوئی غلط خیال آسکتا تھا، اب...... جبکہ وہ زندگی بھر کے لیے کسی اور کا ہونے جارہا تھا۔ اپنا برسوں پرانا خواب چھوڑ کر شاہراہ حیات پر آگے بڑھ رہا تھا۔

''اور اگر کوئی اب بھی ان کے بارے میں غلط سوچے تو ایسی ذہنیت کا کوئی کیا علاج کرے۔ جس کے فتور کو پہاڑ بنانے کے لیے کسی رائی کے دانے کی ضرورت نہ تھی۔''

''تم آئی نہیں رُبا!...... کیوں؟''

حسبِ توقع رات گئے تقریب کے اختتام پذیر ہونے کے بعد زین کا پیغام اس کے نام آچکا تھا۔ اس نے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ اس سے کیا بھی نہیں جاتا۔ رو بیشہ نے اسکرین پر چمکتے الفاظ کو دیکھا۔ پھر نم

آنکھوں کے ساتھ سیل آف کر کے تکیے کے نیچے دبا دیا۔ اس کی بلا سے وہ ساری رات جاگے۔ اب یہ سلسلہ ختم کرنا ہی تھا۔ خود وہ تکیے میں سر چھپائے جانے کب تک روتی رہی۔

☆☆☆

شادی کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

زین اپنی والدہ کے جذباتی دباؤ میں آ کر، ان کی دلائی ہوئی قسم کی تاب نہ لا کر اور جانے کون کون سی انیسویں صدی کی جذباتی دھمکیوں کے بوجھ تلے دب کر ان سے کیا گیا وعدہ نبھا کر سرخرو ہو چکا تھا۔ اس نے دل کی خواہش کا گلا گھونٹ کر ماں کی رضا پر سر تو جھکا دیا تھا...... لیکن دل ابھی پرانی راہوں سے اڑتی گرد میں کھو جانے کا خواہشمند تھا۔ بار، بار ہمک جاتا، قدم رک جاتے، دھیان بھٹک جاتا اور اس سے دھیمے لہجے میں بات کرتی منہل چونک جاتی۔

ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھوں میں اترتی قوس، قزح کو ایک لمحے میں پہچان مل جاتی ہے۔ حسنِ نظر اور دیدۂ بینا شاید اسی کو کہتے ہوں گے۔ جو بدقسمتی سے منہل کے پاس تھی۔ اور اس نے زین العابدین کی بے چینیوں کا عنوان بہت جلد بھانپ لیا تھا۔ وہ سر سے پیر تک آراستہ، سولہ سنگار، سنہری رنگت اوڑھ کر زین العابدین کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ اور وہ ایک لمحے میں اس سے غافل ہو کر رُبا سے کہہ رہا تھا۔

”آج بھی آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس کے لہجے اور انداز سے جھلکتی ایک مان بھری ناراضی کسی خاص دلی تعلق کی گہرائی ناپ رہی تھی۔ لیکن یہ دلی تعلق خاص ہونے کے ساتھ ساتھ، اتنا گہرا اور اٹوٹ ہوگا کہ دنیا زمانے کے کسی پیمانے کی حدِ پیمائش سے باہر ہوگا اس کا اندازہ اسے فوری طور پر اس وقت نہ ہو سکا جب زین نے خود ہی منہل کی جانب تھوڑا دب کر، اسے اپنے برابر میں بیٹھنے کی جگہ دی تھی اور زین کی چچی خود ہی منہل کے برابر میں آ کر اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ ان کے منہ سے کس تواتر سے پھول جھڑتے تھے۔ جیسے بھری شاخِ گل کو کسی نے زور، زور سے جڑ سے ہلا ڈالا ہو۔

”خدا خوش رکھے۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ اللہ رب العزت جیتا رکھے۔“ منہل مسحور ہو کر رہ گئی اور مسحور تو وہ بھی تھا...... اس کا شریکِ سفر۔ رُبا نے مرمریں کلائیوں میں نازک گجرے لپیٹ رکھے تھے۔ کپکپاتی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ کسی بھی قسم کی چوڑی، مہندی، چھلے سے بے نیاز یہ موتیے کی نرملتا سے مہکتا زیور ہی ان کلائیوں کی سجاوٹ تھا...... یا پھر...... کسی کا پسندیدہ گہنا...... فرمائش...... لباس......

”اور اگر تم میرے دوسرے پہلو میں ہوتیں تو شاید...... یہ دنیا جہان کا سنگار اور زیبائش تمہارے وجود کی زینت بنتے۔“

احساسِ زیاں کا ناقابلِ شکست احساس اس کے اعصاب سے کسی اچھا دھاری ناگ کی طرح لپٹ کر رگڑ کھانے لگا۔ اور جب تک اس کے اعصاب اس رگڑ سے آزاد ہوئے، تب تک وہ اچھا دھاری ناگ اس کے دل و ذہن پر اپنی سخت، کھردری، بدرنگ پچھتاوؤں اور افسوس کی کینچلی چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟“ وہ ڈریسنگ کے آئینے میں دیکھتی اپنے نم بالوں کو دھیرے، دھیرے سلجھا رہی تھی۔ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ابھی سے...... ابھی تو بہت ٹائم ہے۔“

”ہاں وہ......“ وہ مصروف انداز میں اپنے شوز اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

”چچی کے گھر چلنا ہے۔ شادی کے بعد ایک چکر بھی نہیں لگا سکے۔“

”لیکن ہمیں تو امی کے یہاں جانا تھا...... بتایا تو تھا۔“ وہ نرمی سے کہہ کر اس کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگی۔

”وہیں سے چلے چلیں گے۔“ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو کوئی پروگرام نہیں

تھا۔ پھر اچانک......"

"رُبا کا فون آیا تھا۔ پائے بنائے ہیں اس نے۔" وہ اب بھی مصروف تھا۔

"ای کے یہاں دعوت ہے۔" منہل نے ہلکے سے جتا ہی دیا۔

"ہاں تو......؟" وہ رک کر اس کا عکس دیکھنے لگا۔

وہ چپ رہی۔

"رُبا بہت مزے کے پائے بناتی ہے۔ کھائیں گے تھوڑی بلکہ لے آئیں گے۔" اگلی بات اور بھی حیران کُن تھی۔

"آپ اس کے گھر پائے لینے جائیں گے؟"

"ہاں تو کیا ہوا...... تمہاری ای کے یہاں دعوت نہ ہوتی تو کھا بھی وہیں لیتے۔" زین کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جانے کے لیے دل سے آمادہ ہے، بخوشی رضا مند۔ منہل کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی ناگواری کی لہر اُمڈ آئی۔

"واپسی میں لے لیں گے۔"

"دیر ہو جائے گی، وہ لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔" اسے ان کے معمولاتِ شب و روز از بر تھے۔

"جاتے وقت ای کے یہاں بھی تو......" شادی نئی نئی تھی۔ وہ بہت احتیاط سے ناپ تول کر بات کر رہی تھی۔

"تو کیا ہوا...... انہیں تو ہمارا انتظار کرنا ہی ہے۔" وہ بے بسی سے ناخن کھرچنے لگی۔

"انتظار کرنا ہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ جو خود سے بلائے، انتظار کرے۔ اسے خوار کر دو۔" وہ صرف سوچ ہی سکی۔ ابھی کہنے کا موقع نہیں تھا۔

☆☆☆

رُبا سنجیدگی سے ٹفن بھر رہی تھی۔ وہ اب کئی سال پہلے والی غیر سنجیدہ، نادان بچی نہیں تھی، نہ صرف رویّے بلکہ چہروں کے تاثرات بھی پڑھ سکتی تھی۔ چھکتا تو زین پہلے بھی نہیں تھا۔ اب بھی خوش دلی کا وہی عالم تھا۔ مگر منہل...... اس کے چہرے پر لکھی بیزاری کی تحریر شاید خود رُبا کے سوا کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ (جو دیکھ سکتا تھا۔ اس نے نظر انداز کر رکھا تھا)

زین، صبغہ کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے بخار کا زور کئی دن بعد ٹوٹا تھا۔ اور وہ اسے بتا رہا تھا کہ اب اسے کڑوی کسیلی دوائیں نہیں کھانی پڑیں گی۔ صبغہ خوش تھی۔ بار، بار اسے دیکھتی۔ کبھی منہل کو۔ ای کونے میں بیٹھی دھیرے، دھیرے مسکرا رہی تھیں۔

پورے منظر میں اگر کسی چہرے پر سنجیدگی تھی تو وہ رُبا کا چہرہ تھا۔ اور اگر کہیں کوفت تھی تو منہل کے چہرے پر۔ دل ہی دل میں بے انتہا اُلجھن محسوس کرتے ہوئے بالآخر اسے اٹھ کر اپنے کمرے میں آنا پڑا۔ وہ سامنے ہی تو تھا۔ دشمنِ جاں...... سکونِ دل۔

"زین!" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔ اس نے یک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں آئے ہیں آپ، یہاں اس وقت؟"

"کیا مطلب؟" اس نے فی الفور صبغہ کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"منہل کا موڈ آف ہو رہا ہے۔ جائیں...... جلدی سے چائے پی کر سسرال سدھاریں۔" زین اس اثنا میں اٹھ کر اس کے نزدیک آچکا تھا۔

"اس نے کوئی بات کی ہے؟"

اس کے چہرے پر غصہ نہیں تھا مگر رُبا اچانک بے طرح گھبرا سی گئی۔ صورتِ حال بے وجہ سنجیدہ بھی ہو سکتی تھی۔

"نہیں...... نہیں، خدا نخواستہ وہ کیوں کچھ کہتی...... نئی دلہن ہے۔ بس آپ جائیں۔" وہ دھیرے سے بولی ذرا ترچھی ہو کر اس کے برابر میں آئی اور پشت سے ہلکا سا دروازے کی طرف دھکیلا۔ پھر دروازے پر نظر پڑی تو دھک سے رہ گئی۔

دروازے میں منہل جانے کب آکر کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت تو واپس پلٹ رہی تھی۔ زین نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس نے اسی لمحے سے اس حادثاتی اتفاق کے اختیاری نتیجے کے انجام کا انتظار شروع

کر دیا۔ جو یقیناً خوشگوار نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

سیل فون اس کی مٹھی میں تھا اور نظریں کسی نادیدہ نکتے پر جامد۔ کتنی دیر گزری تھی اس انداز میں بیٹھے، بیٹھے جب ای نے آکر اسے چونکایا تھا۔

''ای بلال کا رزلٹ آگیا ہے۔ اس نے سی اے کمپلیٹ کر لیا ہے۔'' گہری سانس بھرتے لہجے میں خوشی کے بجائے سنجیدگی غالب تھی۔

''اچھا، یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔'' وہ بولتے ہوئے آگے آئیں۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''بلال نے آنٹی کو کوئی بھی فنکشن کرنے سے منع کر دیا ہے۔'' صالحہ کو اس کی سنجیدگی کی وجہ سمجھ آگئی۔

''اچھا لیکن آپا تو بہت عرصے سے کہہ رہی تھیں کہ بلال کا رزلٹ آتے ہی وہ گھر پر اس خوشی میں دعوت کریں گی اور اس وقت تو بلال بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔ پھر اب!'' ہانیہ نے ایک نظر انہیں دیکھ کر سیل بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا۔

''وہ اس فنکشن کے لیے بہت ایکسائٹڈ تھیں۔ آپ بھول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا وہ اس فنکشن میں میری اور بلال کی انگیجمنٹ کر دیں گی۔''

صالحہ نے بے حد چونک کر بیٹی کا چہرہ کھوجا۔ وہاں صرف سنجیدگی نہیں دکھ کے گہرے سائے بھی تھے۔ انہیں تشویش نے آگھیرا۔

''آج ہی آپا سے بات کروں گی۔'' وہ چپ چاپ دل میں ارادہ کر کے اٹھ گئیں۔ ہانیہ نے کچھ دیر وہیں بیٹھ کر یہ اطمینان کیا۔ وہ اس کے کمرے کی دہلیز سے دور جا چکی ہیں۔ پھر دروازہ بند کر کے حلق میں پھنستے نمکین گولے کو آنکھوں کے ذریعے باہر کا راستہ دکھا دیا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب تکیے کے نیچے غیر معمولی جھنجناہٹ نے اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

اور اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

دوسری جانب خاموشی تھی۔ اس نے اچنبھے سے موبائل کان سے ہٹایا اور مندی مندی آنکھوں سے نمبر دیکھا۔

''زین! کیا ہوا...... آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' اس کے حواس بے اختیار بیدار ہوئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟''

''اس وقت فون کیوں کیا؟''

''یہی پوچھنے کے لیے کہ تم کیسی ہو؟''

''اچھ......!'' وہ جھنجلا سی گئی۔ ''منہل کہاں ہے!''

''اپنی ای کے گھر گئی ہے۔''

''اوہ، اچھا!'' چند لمحے خاموشی رہی۔ ''آپ کو اس وقت مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' چند لمحے خاموشی رہی۔

''جانتا ہوں مگر تم اس دن اس قدر تھکی تھکی سی لگ رہی تھی اور تمہاری خیریت پوچھے بغیر...... تم سے بات کیے بنا میں آ گیا اور ابھی تک ڈسٹرب ہوں۔'' رومیشہ چپ کی چپ رہ گئی۔

''ایک وعدہ کریں زین مجھ سے آپ۔'' بہت ساری باتیں اس کے دھیان میں گڈمڈ تھیں۔ پوری نتھی بنا سلجھائے ایک جانب کر کے وہ سکون سے کہہ رہی تھی۔

''کیسا وعدہ؟''

''آئندہ کبھی رات کے اس پہر یا مغرب کے بعد بھی مجھے فون نہیں کریں گے آپ اوکے!''

وہی مان۔ بات منوا لینے والی حسیات اور دل کی بات بنا کہے جانے لینے والا تفاخر اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔

''اوکے۔'' اسے اور کہنا بھی کیا تھا۔

''اور میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں صبغہ کی وجہ سے کئی راتوں تک نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔''

وہ اب بھی خاموش تھا۔

''ہو گئی تسلی میں بالکل پراپر ڈائٹ لیتی ہوں۔ پابندی سے ناشتا کرتی ہوں اور کھانا بالکل نہیں

چھوڑتی۔‘‘ وہ بات کرتے، کرتے رکی۔
’’منہل اور آپ کے درمیان کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے؟‘‘
کوئی اور یہ گفتگو سن لیتا تو اندازوں کی ورنگی پر یقیناً حیران رہ جاتا۔ مگر دوسری طرف زین تھا اور وہ عادی تھا۔
اس کا دھیان رکھنے کا عادی..... اس کے لیے فکر مند رہنے کا عادی..... اس کے خیال کا عادی۔ حتیٰ کہ خود اس کا عادی۔
اور یہاں وہ خود تھی۔ اس کی رگ، رگ سے واقف۔ جانتی تھی وہ خود تو ٹوٹ سکتا ہے مگر یہ وعدہ نہیں توڑ سکتا۔ اس سے پہلے اس نے زندگی میں ایک ہی بار اس سے وعدہ لیا تھا۔
’’میں آج کالج سے گھر آوں گی۔ تائی امی کی طبیعت پوچھنے کے لیے۔‘‘
’’اوکے، کچھ کھانا ہے تو بتاؤ میں باہر سے لیتا آوں گا۔‘‘
’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ ہنس دی۔ ’’بس میرا انتظار کیجیے گا کھانا ساتھ کھائیں گے۔‘‘
’’جلدی آنا مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔‘‘
’’پھر تو آپ کو وعدہ کرنا پڑے گا کہ جب تک میں نہ آوں آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔‘‘
’’اوکے۔‘‘ وہ فوراً مان گیا تھا۔
اس دن وہ کالج سے تائی امی کی طرف نہیں جاسکی تھی۔ اسے صبغہ کی طبیعت بگڑنے کی خبر مل گئی تھی۔ اسے کالج سے سیدھے گھر جانا پڑا۔ اور وہاں سے امی کے ساتھ صبغہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس شام کے پژمردہ سائے مغرب کی گود میں چھپ رہے تھے۔ جب گھر واپسی ہوئی تو اس کے ذہن میں دور، دور تک زین سے ہوئی گفتگو اور اس کے وعدے کا نام ونشان تک نہ تھا۔
’’رُبا تم گھر کیوں نہیں آئیں۔‘‘ عشا کے وقت زین کا فون آیا۔
’’ہاں، میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔‘‘ اس نے مختصراً صبغہ کی طبیعت کا بتایا۔
’’تو تم نہیں آرہیں۔‘‘
’’ظاہر ہے اب اس وقت کیسے؟‘‘
’’تو پھر میں آجاؤں وہاں۔‘‘
’’کیوں بھئی۔‘‘ وہ اس عجیب فرمائش پر حیران ہوگئی۔
’’رُبا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔‘‘ اس کی آواز میں بیچارگی سی تھی۔
’’لیکن کیوں.....؟‘‘ اس کی آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔
’’تم سے وعدہ کیا تھا، تمہارے بغیر کیسے کھالیتا۔‘‘
اور اس دن روبیشہ کو لگا وہ آئندہ زین سے بھی کوئی وعدہ نہیں لے سکے گی۔ حالانکہ اس نے تو وعدہ وفا کیا تھا۔ لیکن اس کی اسی وفا نے روبیشہ کو خوفزدہ کردیا تھا۔ اور آج پھر وہ اس سے ایک وعدہ لے بیٹھی تھی۔ ایک ایسا وعدہ جسے نبھانا، زین کے لیے آسان نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔
وہ فون بند کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ اس رشتے کے لیے جو ان ٹوٹ تھا۔ مگر ان دیکھا تھا جو بے نام تو تھا مگر بے حقیقت نہیں۔

☆☆☆

کمرے کی فضا بے حد بوجھل اور سنجیدہ تھی۔ ابھی چند دن پہلے تو اس کا رزلٹ آیا تھا۔ اور امی جو بات کررہی تھیں۔ اس کے لیے وہ ذہنی طور پر ابھی تو کیا کبھی تیار نہیں تھا۔
وہ کافی دیر تک اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ابھی انہوں نے جو بات سنی ہے وہ ان کے اپنے بیٹے نے کی ہے۔ وہ اس سے صرف یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ وہ اس کی کامیابی کو جس طریقے سے منانا چاہتی تھیں بلال نے اس سے انکار کیوں کردیا تھا۔ وہ مستقل انہیں ٹال رہا تھا کئی دن سے۔ اور آج ان کی سوچ بدل چکی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھیں وہ اس سے بات نہ ہی کرتیں تو بہتر تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم کہہ رہے ہو......
بلکہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہا کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔''
بلال جانتا تھا اس کی بات والدین کے لیے صرف غیر متوقع نہیں بلکہ بہت دکھ کا باعث بھی ہوگی۔ لیکن وہ اس معاملے میں خود کو بالکل بے بس پاتا تھا۔
''آپ کی سمجھ میں تب آئے گا جب آپ سمجھنا چاہیں گی۔''
''یہ کیا بات ہوئی...... بات تو تم نہیں سمجھ رہے، ایسا لگ رہا ہے جو دل چاہا منہ اٹھا کر بول دیا۔''
''امی!'' بلال نے کچھ کہنا چاہا۔
''اور نہیں تو کیا تمہیں کچھ ہوش بھی ہے کیا بکواس کررہے ہو؟'' وہ ایک دم ہی غصے میں آگئیں۔ بلال دنگ رہ گیا۔ انہوں نے کبھی اس طرح چیخ کر بات نہیں کی تھی۔
''امی پلیز آرام سے بات کریں۔''
''آرام سے بات کروں۔ تمہیں اندازہ ہے کتنے بڑے طوفان کو دعوت دے رہے ہو اور اوپر سے مجھ سے کہتے ہو آرام سے بات کروں۔''
''میں نے کس طوفان کو دعوت دی ہے امی؟''
''یہ طوفان کو دعوت دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ اپنی بہن کی لڑکی چھوڑ کر میں اس کی سوکن سے رشتہ کرلوں۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ اپنی بہن کو مجھے بیٹی دینی بھی ہے۔''
وہ لب بھینچے بیٹھا تھا۔
''غضب خدا کا...... ایک لمحے کے لیے باقی زندگیوں کے بارے میں سوچ لیا ہوتا تو یہ بات منہ سے ہی نہ نکالتے تم۔''
''شاہ نور اور دانیال کی بات الگ ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہانیہ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔''
''تو کیا اس میں بھی میرا قصور ہے۔'' وہ اور غضب ناک ہوگئیں۔
''کتنے سالوں سے تو پتا تھا تمہیں کہ وہ تمہاری بیوی بنے گی۔ پھر کیوں نہیں دیکھا اسے اس نظر سے۔''
بلال نے خود کو سخت مشکل میں محسوس کیا۔ بات وقت سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی۔ لیکن یقیناً وقت سے پہلے تو کیا، وقت پر بھی ختم ہونے والی نہ تھی۔
''اور وہ جس نے تمہارے علاوہ کسی اور کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں...... وہ کیا کرے۔''
''آپ کو اس کا کتنا خیال ہے اور میں......؟ میرا کوئی خیال نہیں۔''
''کیوں نہیں، تمہارے بارے میں میرا صرف یہ خیال ہے کہ تم پاگل ہوچکے ہو اور کچھ نہیں۔'' انہوں نے قطعی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بات ختم کردی اور کمرے سے فوراً باہر نکل گئیں۔
آج انہیں اپنے بیٹے پر اس قدر غصہ آیا تھا۔ جتنا پوری زندگی میں کبھی نہیں آیا ہوگا۔ جبھی اپنے شوہر ریحان سعدی کو ساری بات بتاتے ہوئے وہ اختیار ہو کر سسکنے لگیں۔
''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا زندگی میں کہ بلال اس طرح کی بات کرسکتا ہے۔'' ریحان صاحب خود اتنے شاکڈ ہوئے ان کی بات سن کر کہ بجائے انہیں تسلی دینے کے خود سوچ میں پڑ گئے۔
''اگر یہی ضد رہی تو میں اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' ان کا گلا رندھ گیا۔
''اُفوہ، تم اتنی جلدی کیوں حوصلہ ہارنے لگیں بھئی۔ بچہ ہے بلال سمجھ جائے گا۔ تم اب آئندہ ایسے غصہ مت کرنا ورنہ بات بگڑ بھی سکتی ہے۔''
خود اندر ہی اندر فکر مند ہوجانے کے باوجود اس وقت انہوں نے کمالِ اطمینان کا مظاہرہ کیا تھا۔

☆☆☆

بہت سال پہلے جب صداقت صاحب کے گھر میں روبیشہ نے اپنی ہم شکل اور ہم عمر بہن کے ساتھ دنیا میں آنکھ کھولی تو وہ اپنے ماں باپ کے لیے اپنے ساتھ زندگی بھر کے دکھ لے کر آئی تھی۔ ننھی پری کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اس سے جڑے دوسرے وجود کی محرومیوں نے ماں، باپ کے دلوں پر کیسی قیامت ڈھائی ہے۔ صبغہ کی آنکھوں میں نقص تھا۔ وہ دماغی طور پر اپنے

ساتھ کے بچوں سے پیچھے تھی۔ ستم بالائے ستم اس کی ایک ٹانگ بھی تقریباً بیکار ہی تھی۔

روبیشہ کے صحت مند جسم اور صحت مند دماغ کی ساری خوشی صبغہ کی کمزوری نے ڈھانپ لی اور ہر ایک خوشی پر اس کے ادھورے پن کا غم غالب آگیا۔ پھر بساط بھر علاج ناامیدی کے سائے میں کروایا بھی گیا لیکن بے سود۔ صداقت صاحب کو اولادِ نرینہ کی بے انتہا خواہش تھی۔ لیکن جڑواں بیٹیوں کی پیدائش اور اس کے بعد ان میں سے ایک کو اس قدر غیر متوازن دیکھ کر ان کا دل بے انتہا ڈر گیا۔ اور انہوں نے سوچا۔

''میں کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا ہوں۔ اللہ کی رحمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے شاید میں بیٹا نہ ہونے پر مایوس ہو چلا تھا۔ جبھی میرے رب نے مجھے نامکمل اولاد دے کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ بیٹا یا بیٹی ہونا اتنا ضروری نہیں۔ جتنا اولاد کا صحت مند ہونا۔''

انہوں نے اپنی خواہش دل میں دبا کر صبر کرلیا۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ امینہ بیگم، روبیشہ کے بعد بھی دو بار امید سے ہوئیں اور دونوں بار انہوں نے صحت مند بیٹوں کو جنم دیا۔ لیکن شومئی قسمت کہ دونوں میں سے کوئی بھی چند گھنٹوں سے زیادہ نہ جی سکا۔ صداقت علی کو پے در پے دو بیٹوں کی نارمل پیدائش اور فوراً بعد اموات کے صدمے نے نڈھال کردیا۔ وہ جو صبر کی تلقین خود کو اور سب گھر والوں کو کر کے بیٹھے تھے۔ ایک دم بے صبرے سے ہوگئے۔ اور سب گھر والوں سے چھپ کر محض اولادِ نرینہ کی خواہش میں دوسری شادی رچالی۔

شادی کو دوسرا سال لگا ہی تھا کہ اللہ نے ایک خوب صورت بیٹے سے نواز دیا۔ اور وہ تمام دنیاداری بالائے طاق رکھ کر اپنی خوشی میں سب کو شریک کرنے دوسری بیگم اور بیٹے کے ساتھ چلے آئے۔ یہ بھول کر کہ ان کی خوشیاں کسی کے لیے اندوہ ناک بھی ہوسکتی ہیں۔ امینہ بیگم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس وقت تک زین العابدین کے ماں باپ الگ گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ امینہ بیگم اپنی ساس کے ساتھ اسی گھر میں رہتی تھیں۔ امینہ بیگم نے بوجھل دل کے ساتھ خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ لیکن ان کی ساس تو صداقت علی کی ماں تھیں کب تک پوتے کو نظر انداز کرتیں۔ صداقت علی کی طرح وہ بھی دو بچوں کی موت کا صدمہ دل پر لے کر بیٹھی تھیں۔ سو دل کا نرم پڑنا تو فطری تھا...... بعد میں صداقت علی نے امینہ بیگم سے معافی بھی مانگی۔ لیکن وہ اپنی سوکن کو دل میں جگہ دے سکیں نہ گھر میں۔ صداقت علی کے لیے یہی بہت تھا کہ امینہ نے اس شادی کو دل سے قبول کرلیا تھا اور اسے قبول کرنا بھی امینہ کی مجبوری تھی۔ نہ کرتیں تو کون سا صداقت علی نے پروا کرنی تھی۔

جو ہونا تھا ہو چکا کے مصداق دن اپنی ڈگر پر چل نکلے۔ صداقت صاحب کی نئی بیگم صالحہ، تائی امی کی دور کی کزن تھیں۔ دیورانی، جیٹھانی کے تعلقات میں ہونے والے معمولی فطری کھنچاؤ کو اس بہانے سے خوب ہوا ملی۔ امینہ بیگم کو بھی بیٹوں کی پیدائش کے فوراً بعد بغیر کسی وجہ کے موت کے منہ میں چلے جانے کا صدمہ تھا۔ بلکہ ان کا دکھ تو سب سے بڑھ کر تھا۔ انہیں اولادِ نرینہ تو ملی نہیں، دنیا میں جو واحد سہارا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ شوہر کی طرف سے لگایا گیا ذہنی دھچکا کم نہ تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر مضطرب ہوگئیں کہ نہ گھر کی ٹھیک طرح دیکھ بھال کر پائیں نہ بچوں کی۔ جبکہ صبغہ تو ہر وقت خاص توجہ کی متقاضی تھی۔

صداقت علی کے دل میں ان کا مقام پہلے ہی گر چکا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ بالکل ہی دوسری بیوی کے ہوگئے۔ ایک ماں کے دم سے تعلق بحال تھا۔ اِدھر ان کی آنکھیں بند ہوئیں اُدھر صداقت صاحب کی آمدورفت بھی بالکل بند ہوگئی۔ وہ اس گھر کا راستہ ہی بھول گئے۔ جہاں صحیح معنوں میں ان کی ضرورت تھی۔ سوائے پہلی تاریخ کو ماہانہ خرچہ بھیجنے کے انہوں نے کبھی بیوی بچیوں کی خبر گیری نہ کی۔ سوائے بڑی بیٹی یمنٰی کی شادی کے وقت مالی امداد کے وہ دونوں بیویوں میں کبھی انصاف نہ کرسکے۔

گزرتے وقت نے جہاں ہر زخم داب دیا۔
وہیں امینہ بیگم کی زندگی بھی ایک نئے ڈھب سے گزرنے لگی۔ انہوں نے معصوم بچیوں کی تعلیم و تربیت میں خود کو اس طرح گم کرلیا کہ سرے سے بھلا ہی بیٹھیں کہ وہ سہاگن ہیں یا صداقت علی نامی کسی شخص سے ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ امینہ بیگم کو بھی جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ دنیا میں ان بچیوں کا ان کے سوا اور ان کا ان بچیوں کے سوا کوئی نہیں انہوں نے خود کو بھی سنبھالا اور اپنی اولاد کا بھی سہارا بن گئیں۔
بیٹے کے بعد صداقت علی کو اللہ نے بیٹی سے بھی نوازا۔ ان کی زندگی ان کا خاندان ہر لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا۔ ان کی بڑی سالی جنہوں نے ان کی دوسری شادی کروانے میں بہت ساتھ دیا تھا۔ دو بچوں دانیال اور ہانیہ کی ماں تھیں۔ صداقت علی ان کے دونوں بچوں سے اپنے دونوں بچوں کو منسوب کرکے مطمئن ہو بیٹھے۔
بلال ان چاروں میں سب سے بڑا تھا۔ جبکہ دانیال اور شاہ نور کے درمیان عمروں کا فرق بہت کم تھا۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی بہت تھی۔ جبکہ ہانیہ ان تینوں سے چھوٹی اور کچھ بے پروا قسم کی لڑکی تھی۔

☆☆☆

موسم ابر آلود تھا۔ عین ممکن تھا کہ اگر بارش ہو جاتی تو سردی کی شدید لہر اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ خشک ہوائیں اور سوکھے پتے دن بھر گھاس کے چھوٹے سے قطعے پر بار بار بکھرتے رہتے۔
اپنے کمرے کی بڑی ساری گلاس ونڈو کے پردے سرکا کر اس نے باہر دیکھا۔ ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ایک نظر اس موسم پر اور دوسری بستر پر نیم دراز اپنے مجازی خدا پر ڈالی۔
''موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔ ڈرائیو پر چلیں۔''
اسے ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس کی بات مان لے گا۔ جبھی اسے اٹھتے دیکھ کر اپنی ساس کو بتانے بھاگی۔

ہوش والوں کو خبر کیا

بے خودی کیا چیز ہے

دھیمے سروں میں بجتی موسیقی، ہلکی کن من اور قدرے زیادہ خنکی۔ گاڑی کے اندر مہکتا قرب اور دھیمی سی حدت۔ سب ہی کچھ سامنے والے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ایک مکمل منظر پیش کررہا تھا۔ اس نے بے حد محبت سے زین کی سنجیدگی کو دیکھا۔
''کیا سوچ رہے ہیں!'' دل اوپیں میں شوخ ہوا۔
''کچھ نہیں۔ کچھ کھاؤ گی۔'' شاید اسے بھی ''آداب آدتنگ'' یاد آگئے۔ وہ اسے ایک مشہور ڈھابے پر لے آیا تھا۔ بھوک تو تھی نہیں اور گاڑی سے نکلنے کا بھی دل نہ چاہا۔ گاڑی کے اندر ہی بھاپ اڑاتی چائے اور گرما گرم پکوڑوں سے مزاج کی خوشگواریت سوا ہوگئی۔ وہ اسے دیر تک اپنے کالج کے قصے سناتی رہی۔ زین دھیرے، دھیرے مسکراتا رہا۔
''آپ بھی تو کوئی بات کریں۔ اپنے فرینڈز کی یا کالج لائف کی۔'' اسے بالآخر خیال آگیا کہ وہ خود ہی بہت دیر سے بولے جا رہی تھی۔
''میرا کوئی اتنا قریبی دوست نہیں تھا۔'' وہ یونہی بول پڑا۔
''واقعی کوئی بھی نہیں۔'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔
''نہیں، میری روبیشہ کے سوا کسی سے بھی دوستی نہیں ہوسکی بس وہ ہی تھی۔'' وہ سادگی سے بتا کر چائے کا سپ لینے لگا۔ یہ دیکھے بنا کہ اس کی سادگی نے کسی کے دل پر کیسی قیامت ڈھائی تھی۔
''دوستی ہو نہیں سکی یا اس نے کرنے نہیں دی۔'' اس نے حتی الامکان لہجے کو سرسری ہی رکھا تھا۔ مگر پھر بھی زین چونک سا گیا۔
''ہاں کہہ سکتی ہو۔ اس نے کوئی شعوری کوشش نہ بھی کی ہو تب بھی اس کی موجودگی میں مجھے......''
''تو آپ نے اس سے شادی کا نہیں سوچا؟''
چائے کی ساری تلخی یکلخت اس کے لہجے اور آواز کو چھوڑ کر باقی ہر چیز میں امڈ آئی۔

''سوچا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا یہ سکون کسی کا سکون غارت کر رہا ہے پھر بھی......

''پھر؟'' منہل کو لگا اس کے اردگرد کا سارا منظر پت جھڑ میں اڑتے سرخ بگولوں میں بدل گیا ہے اور ان بگولوں کے بیچ کہیں ایک صدا چکراتی پھر رہی ہے۔

''پھر؟''

''پھر...... پھر......''

''پھر خیال آیا کہ دوست، دوست ہوتا ہے اور بیوی، بیوی۔ دونوں رشتے اپنی جگہ پر رہیں تو بہتر ہے۔''

خدا جانے اس نے بات سنبھالی یا پلٹ دی۔ منہل کو تو لگا کہ سننے میں مغالطہ ہوا ہے وہ جگہ کی جگہ لفظ ''حد'' استعمال کرنا چاہتا تھا شاید۔

''چلیں۔''

واپسی میں پارسل اس کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے وہ بے نیازی سے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کسی کا مزاج تو کیا نظامِ ہستی ایک خیال نے درہم برہم کر دیا ہے۔

''تو میں کیا ان کی دوست نہیں بن سکتی۔'' اس کے دل پر بوجھ آ پڑا۔ ستم بالائے ستم واپسی پر زین کو اپنی دوست کی یاد ستانے لگی۔ پارسل اس کے لیے بنوائے گئے تھے۔ منہل کو اب پتا چلا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں، اس کے لیے تو یہ چیزیں لی ہیں، دے تو آئیں۔''

''ہاں تو آپ نے لی ہیں، آپ دے آئیں۔ مجھے فورس مت کریں۔'' اس کے اکھڑ لہجے میں عجیب سی ضد تھی۔ زین کو خاموش ہونا پڑا۔

گیٹ پر گاڑی روک کر وہ شاپر لے کر اترا اور گیٹ پر لگا لوہے کا گول دائرہ گھما کر ٹک کی آواز کے ساتھ گیٹ کھولا اور بے تکلفی سے اندر گھستا چلا گیا۔

منہل کے لیے ہر بات دکھ کا باعث بن رہی تھی۔ پہلے آؤٹنگ کے پروگرام میں بدمزگی پھر اسے زبردستی یہاں لے کر آنا۔ اور اسے بیٹھا چھوڑ کر چلے جانا پر سے اتنی بے تکلفی سے اور اب یہ طویل انتظار...... اسے ہر پہلو میں چبھن محسوس ہونے لگی۔

بوندا باندی کے بعد کا حبس، مچھر، مکھیاں اور آتے جاتے لوگ وہ مشکوک بن رہی تھی۔ محلے والے یقیناً زین کی گاڑی پہچانتے ہی ہوں گے۔ چودہ منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ لیکن دروازے پر نمودار ہونے والا مسکراتا چہرہ اور بھی جی جلانے کا باعث بن گیا۔

''زین تو اس قدر بدتمیز ہیں کہ حد نہیں۔ خود تو اندر چائے پی رہے ہیں اور بتایا تک نہیں کہ آپ باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں، اندر کیوں نہیں آئیں؟ آیئے ناں!'' وہ ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی میں جھک کر بولے گئی۔

''آئی ایم سوری منہل آپ کو بہت کوفت اٹھانی پڑی۔'' منہل کے چہرے پر بھولے سے بھی مسکراہٹ نہیں آسکتی تھی۔

''زین کو بھیجو جلدی۔'' رُبا کی چلتی زبان کو کسی نے فل پاور سے بریک لگایا۔

''اوکے۔'' وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

دو تین منٹ بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ سنجیدہ چہرہ، بگڑے تیور...... لیکن دوسری طرف بھی جو خاتون موجود تھیں، کسی مڈل کلاس نیم خواندہ گھرانے سے تعلق رکھنے والی عورت نہ تھی کہ مجازی خدا کی پیشانی کی شکن اس کی ہتھیلیاں نم کر دیتی۔

''کیا کرنے بیٹھ گئے تھے جو دس گھنٹے لگا دیے آنے میں۔'' زین چپ رہا۔ اسے اور غصہ آیا۔

''دو شاپر پکڑانے کے لیے تو گیٹ سے اندر جانا بھی ضروری نہیں تھا اور یہاں بیٹھ کر تی پارٹی انجوائے کی جا رہی تھی۔''

''اندر نہ آنے کا فیصلہ تمہارا اپنا تھا۔''

''اور چائے کے بہانے آنکھیں سینکنے کا فیصلہ آپ کا اپنا۔''

بدلحاظی کبھی الفاظ کا چناؤ نہیں سکھاتی۔ ہم ایک شہد آگیں بات کو حلق کا کانٹا بھی بنا سکتے ہیں۔ جس کی کڑواہٹ برس، برس کر حلق میں جاتی رہے۔ زبان پر

بھی جلتی رہے۔ لیکن نہ اگل سکیں نہ نگلتے بنے۔
زین کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے فی الفور بحث کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی گھر کی طرف موڑلی۔ اس کی خاموشی اور جلتی پر تیل کا کام کرتی رہی۔

☆☆☆

ناپسندیدہ بات اور ناگوار قدم کتنے ہی دیو قامت کیوں نہ ہوں۔ صرف پہلی بار مشکل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جھجک ختم ہو جاتی ہے۔ پردہ سرک جاتا ہے اور بھرم کرچی، کرچی...... جیسے آمنہ ریحان کا بھرم ٹوٹا بالکل اچانک ان کی اپنی بہن کے آگے۔ وہ بڑے فیصلہ کُن انداز میں اپنا پرس اور شال لے کر لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے بلال کے پاس آئی تھیں۔

''میں جا رہی ہوں صالحہ کے گھر تمہاری اور ہانیہ کے رشتے کی بات کرنے۔'' ان کی آواز تیز لیکن کھوکھلی سی تھی۔ بلال کے لیے ان کی بات اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ جتنی انہوں نے سوچی تھی۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''لیکن کیوں؟ میں آپ کو منع کر چکا ہوں، میں ہانیہ سے شادی نہیں کروں گا۔'' اس کا لہجہ دھیما لیکن مضبوط تھا۔

''جہاں تم چاہتے ہو وہاں تمہاری شادی نہیں ہو سکتی اس لیے بہتر ہے کہ...'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔ اور بازو لپیٹ کر قالین گھورنے لگیں۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

وہ ہنوز منہ موڑے قالین کا ڈیزائن یاد کرتی رہیں۔

''آپ کے پاس روبیشہ کو ریجیکٹ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''تمہارے پاس ہانیہ کو ریجیکٹ کرنے کی وجہ ہے؟'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولیں۔ وہ جھنجلا گیا۔

''یہ وجہ کیا کم ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔''

''تو میں بھی روبیشہ کو پسند نہیں کرتی بس۔'' وہ مسلسل اسے زچ کر رہی تھیں۔

''اُف خدایا!'' اس نے شدید غصے میں ریموٹ پٹخا۔ ''آپ امی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں زندگی مجھے گزارنی ہے آپ کو نہیں۔'' اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔

''اور تم کیوں نہیں سمجھتے کہ خاندان والوں کو منہ مجھے دکھانا ہے، تمہیں نہیں۔'' انہوں نے بھی آج ہی سب کہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

''خاندان والے آپ کے لیے میری خوشیوں سے زیادہ اہم ہیں؟''

''ہاں! بالکل ایسے ہی جیسے وہ دو ٹکے کی لڑکی تمہارے لیے ماں سے زیادہ اہم ہے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے خاندان والوں پر اور......'' اس نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا۔

''اور...... اور کیا...... مجھ پر اپنی ماں پر، بولو...... کہہ دو، ابھی وہ منحوس گھر میں آئی نہیں اور میری اولاد کا یہ حال ہے...... بعد میں تو......''

وہ اسے کچھ بھی بولنے کا موقع دیے بغیر بھڑک سی گئیں۔ وہ نفی میں سر ہلاتا کچھ کہنے کی کوشش میں ناکام ہو کر سر تھام کر صوفے پر گر گیا۔

''ماما!'' شاہ نور نے لاؤنج کے داخلی دروازے میں قدم رکھ کر ان کی بے بھاؤ سناتی آواز کو روکا۔

''کیا ہوا ہے؟ آپ کا اور خالہ کا جھگڑا...''

وہ ابھی، ابھی کہیں باہر سے لوٹی تھی۔ چہرے پر پریشانی اور گھر میں پکنے والی کھچڑی کے پس منظر سے کسی حد تک واقف ہو چکی تھی۔

''خالہ؟ خالہ سے کیوں ہو گا جھگڑا۔ میں تو ابھی ان ہی سے نہیں نمٹی۔''

''تو پھر وہ اتنے خراب موڈ میں کیوں تھیں۔ تیزی سے گیٹ سے نکلیں اور چلی گئیں۔''

بلال ہکا بکا سا سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''کیا، صالحہ آئی تھی یہاں؟'' انہیں اپنے پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ

دوسرا اور آخری حصہ

روبینہ کے لیے اس کی پسندیدگی کی عمر اتنی طویل نہیں تھی۔ جتنی ہانیہ کو ناپسند کرنے کی۔ وہ جدید دور کی پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ اسی حساب سے اس کا پہناوا تھا اور اسی انداز کا گفتگو کا طریقہ۔

بلال کو اس میں کوئی بات ایسی نہ لگتی کہ وہ اس کی جانب مائل ہو جاتا۔ سوائے اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی پسندیدگی جو صرف اور صرف خاص الخاص بلال کے لیے تھی اور جسے محسوس کر کے وہ اور زیادہ کوفت میں مبتلا ہو جاتا...... اور اس چیز کو جب وہ شاہ نور کے ساتھ مل کر انجوائے کرتی تو غصے کے مارے اس کا دل

چاہتا کہ اس کے ساتھ، ساتھ اپنی بہن کا بھی گلا دبا دے جو ہانیہ کے بڑے بھائی دانیال سے منسوب تھی۔

اس نے بار بار روبیشہ کو خاندان کی تقریبات میں سجے سنورے دیکھا تھا۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود رشتے داری ایسی قریبی نہ تھی اور نہ ہی اس نوعیت کی تھی کہ بحالتِ مجبوری خاندان ہی کی تقریبات کے علاوہ ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا ہوتا، دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی عرصہ دراز تک یہی سمجھتا رہا کہ روبیشہ، زین ہی کی شریکِ سفر بنے گی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی دونوں کو بلا وجہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے نہیں دیکھا۔ جیسا کہ ہانیہ سارے جہان میں بیانگِ دہل بلال کو اپنا فیانسی کہتی پھرتی تھی۔ اسے اس بات کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ بلال کو یہ بات کیسی لگتی ہے۔ اس کے برعکس روبیشہ کا تمیز دار لباس، دھیما انداز اور خصوصاً زین العابدین کے ساتھ بے حد معتدل رویہ، ہمیشہ اس کی نگاہوں میں پسندیدہ رہا۔

زین العابدین کی کسی اور سے شادی اس کے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی، جتنی دوسروں کے لیے۔ لیکن اس نے چند ہی روز بعد دل میں خواہش کی ایک نئی نازک کونپل کو پھوٹتے دیکھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کونپل، ست رنگے پھولوں سے لدی بیل میں بدل گئی...... جس نے اس کے دل کی چار دیواری کو اپنے سبزے سے ڈھانپ لیا تھا۔

اسے یوں لگنے لگا جیسے روبیشہ سے کتنے برسوں پرانی شناسائی ہے۔ مہینوں سے اس کی شکل تک نہ دیکھنے کے باوجود وہ اسے چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کا تصور کرتے، کرتے، اتنی دور پہنچ جاتا کہ یہ حقیقت خود بخود اپنا وجود کھو دیتی کہ روبیشہ کو اس کے ارادوں کی بھنک تک نہ تھی۔ اور وہ سب کچھ جاننے کے بعد کیا سوچتی، کیا کہتی، کیا سمجھتی اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی...... شاید اس کو خود پر ضرورت سے زیادہ بھروسا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں ایک محسوس کیا جانے والا تناؤ تھا۔ تائی امی جہاں بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھیں وہیں بہو سے شرمسار۔ وہ سمجھتی تھیں زین کی زندگی میں کسی اور کے آجانے سے رُبا خود بخود نکل جائے گی۔ شریکِ حیات کی اپنی ایک الگ مستحکم حیثیت ہوتی ہے۔ مگر ان کی سب تدبیریں ایک کے بعد ایک ناکام ہوتی چلی گئیں۔ جب زین نے جاب شروع کی تو انہوں نے اپنے شوہر کا مکان بیچ کر دیورانی کے گھر سے دور دراز علاقے میں بہتر جگہ پر نیا گھر لے لیا۔ تاکہ زین کی آمدورفت کم ہو سکے۔

اپنی بہو کی تلاش میں انہوں نے کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے۔ جو حور پری وہ زین کے لیے چن کر لائی تھیں اس کے حسن کی چمک سے ان کی اپنی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ زین تو پھر مرد تھا۔ انہیں پتا تھا کہ تھوڑے ہی دن اس کے خوب صورت ساتھ کے آگے روبیشہ اور زین کی (اپنے تئیں) نام نہاد محبت کہیں منہ چھپا کر بھاگ جائے گی۔ سارا خاندان بشمول ان کی دیورانی اور خود رُبا کے، منہل کے حسن کے قصیدے پڑھتا نظر آیا۔ شادی والے دن ان کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔ جب ولیمے میں انہوں نے زین کے دائیں بائیں منہل اور روبیشہ کو بیٹھا دیکھ کر ان کا موازنہ کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ رُبا کو اس بلکہ کسی بھی قسم کے تقابل کے قابل ہی نہیں گردانتی تھیں۔ نہ وہ صورت میں اس کے برابر تھی... نہ تعلیم، نہ خاندانی اسٹیٹس اور سب سے اہم چیز ذہنی ہم آہنگی اور سیرت تو ان کے نزدیک قابلِ غور چیزیں تھیں ہی نہیں۔

کئی مہینے گزر جانے کے باوجود وہ دونوں اوائل دنوں کے مانند دور، دور، خاموش اور لاتعلق نظر آتے تھے۔ شادی شدہ جوڑے تو اوائل ایام میں بے حد قریب، پُرجوش اور خوش دِکھتے ہیں۔ وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ نہ زین کی نظریں معنی خیز تھیں کچھ کہتی، کچھ سنتی، بولتی۔ نہ منہل کے عارض گلگلوں ہوتے۔ نہ اٹھتی گرتی پلکیں، نہ حیا آمیز مسکراہٹ۔

''یہ سب رو بیشہ کا ہی کیا دھرا ہے۔'' بالآخر وہ فیصلہ کن انداز میں سوچتی ہوئی اٹھیں۔ منہل لاؤنج میں پتھر کا بت بنی ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ اسے بتا کر باہر نکل آئیں۔ ان کا رخ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب تھا۔ دیورانی کے گھر کا راستہ قدرے لمبا سہی مگر اتنا بھی طویل نہ تھا کہ وہ زین کے علم میں لائے بنا وہاں جا نہ سکیں۔

☆☆☆

ریحان سعدی گہری نظروں اور انتہائی سنجیدگی سے اپنے اکلوتے فرمانبردار بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شرمسار تو تھا لیکن اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہاری دونوں باتیں بڑوں کی ناراضی کا سبب بن رہی ہیں۔ ہانیہ سے شادی سے انکار بھی اور اس لڑکی کی ضد بھی۔'' اپنی بیگم کی بہ نسبت انہیں روبیشہ اور اس کے گھر والوں سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی۔ بلکہ منصفانہ طریقے سے سوچتے تو وہ ہی انہیں ہمدردی کی مستحق بھی نظر آتیں۔

''لیکن دونوں باتیں جائز بھی ہیں اور میرا حق بھی۔ میں ہانیہ سے شادی سے انکار بھی کر سکتا ہوں اور مرضی کا انتخاب بھی کر سکتا ہوں۔''

آمنہ کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے، یہ صرف اتنی سی بات نہیں ہے بلال۔ اگر ہانیہ تمہیں پسند نہیں تو کہیں اور کرلو شادی مگر وہاں...... وہاں نہیں۔''

''کیوں نہیں؟'' وہ اب بھی پرسکون تھا۔

''ایک تو وہ میری بہن کی سوکن کی لڑکی ہے دوسرے تم...... تم کچھ نہیں جانتے۔ بھئی اسے سمجھائیں ناں'' وہ آخر میں زچ ہو کر پھر شوہر کی طرف مڑ گئیں۔

''بیٹا، اس فیملی میں صرف ایک اس لڑکی کو چھوڑ کر باقی سب میں کوئی نہ کوئی فزیکل یا مینٹل ڈسٹربنس ہے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ خود ان کی اپنی والدہ کوئی صحت مند خاتون نہیں تھیں۔ جبھی تو صداقت کو دوسری شادی کرنا پڑی۔'' انہیں جوان بیٹے سے نظریں چرانا پڑیں۔ آمنہ کا سر بھی جھک گیا۔

''اس کی اپنی جڑواں بہن فلی مینٹلی ایبنارمل ہے۔ بڑی بہن بے اولاد ہے اور بچپن میں دو بھائی پیدا ہوتے ہی انتقال کر چکے۔ ایسی لڑکی سے شادی کی خواہش؟ اور کون ضمانت دے گا کہ مستقبل میں وہ اس قسم کی مشکلات سے دوچار نہیں ہوگی۔ یا اسے ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوگا۔''

انہوں نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

''اس بات کی ضمانت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا بابا اور بھلا مستقبل کی کسی بھی بات کی ضمانت دے ہی کون سکتا ہے۔ اللہ کے سوا......؟''

''تم اپنا منہ بند ہی کرلو تو بہتر ہے۔ ارے سالوں سے وہاں دیکھ رہی تھیں امینہ بیگم مگر ہوا کیا۔ اس نے بھی دکھادی ناں ہری جھنڈی۔ ظاہر ہے آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔ بس اب تم بھی اس بات کو یہیں ختم کر دو۔''

اپنی طرف سے انہوں نے جھٹ پٹ معاملہ نمٹایا تھا۔ مگر بلال ایک دم بھڑک اٹھا۔

''ہرگز نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس طرح کی فضول فکریں پکڑا کر میرا ارادہ بدل دیں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف روبیشہ سے بس۔'' وہ بولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ آمنہ حق دق رہ گئیں۔ باپ کے سامنے اس قدر بدتمیزی اور بلال۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں لیکن ریحان سعدی سمجھدار تھے۔ وہ نہ تو حیران تھے اپنی بیگم کی طرح...... نہ ضدی تھے اپنے بیٹے کی طرح۔ وہ پرسوچ انداز میں دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے جہاں سے بلال باہر نکلا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں بلال کی بات مان لینی چاہیے۔'' کافی دیر بعد ان کے منہ سے نکلا۔ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

''ارے واہ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کہہ دی آپا!'' فون پر صالحہ تھیں۔ ان کا ردِعمل توقع سے بہت قریب تھا۔

''آسانی سے نہیں کی ہے صالحہ! تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر ایک طرف تمہاری بیٹی ہے تو دوسری طرف میری اپنی اولاد اسی فیصلے کی زد میں آکر نقصان اٹھائے گی۔''

''تو پھر یہ بیوقوفی کیوں؟ مزے آگئے بلال کے تو۔ بیٹھے بٹھائے من کی مراد مل جائے گی اور میری بیٹی اس کا کیا کروں میں ؟ وہ بیمار پڑگئی ہے۔ جب سے گھر میں یہ بات نکلی ہے۔'' ان کی آواز بھرا سی گئی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ صالحہ میں کیا کروں۔ ایک طرف ہماری بیٹیاں ہیں تو دوسری طرف......'' انہوں نے دانت بھینچ کر اپنا غصہ نکالا۔ خدا جانے بلال پر یا روبیشہ پر۔

''اور اب تو ریحان بھی اس کی حمایت کر رہے ہیں۔'' آمنہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ بلال کو روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیں۔ جس نے انہیں اپنی بہن کے سامنے شرمندہ کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اس روبیشہ کو تو کچا ہی چبا ڈالیں۔

''تم ذرا ایک دو دن صبر کرو آپا، میں صداقت سے کہتی ہوں۔'' صالحہ کی پُرسوچ آواز نے ان کے مُردہ جسم میں جیسے نئی روح پھونک دی۔

''ہیں؟ تم بات کروگی ان سے وہ مان جائیں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ بھی ان بیوی، بیٹیوں کا نام تو زبان پر نہیں لاتے۔ مگر خرچہ بھیجنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔''

ان کے صاف گوانداز پر وہ ڈھیلی سی پڑ گئیں۔

''اچھا دیکھو! خدا کرے کوئی صورت نکل آئے۔''

دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے انہوں نے مُردہ دلی سے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

مغرب کا دھندلا سماں اپنے پر پھیلائے سرد اداسی میں اونگھ رہا تھا۔ جبھی ایسا لگا جیسے گھر میں بھونچال آگیا ہو۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی۔ کب سے جائے نماز پر بیٹھی اپنے مجازی خدا کے مزاج مل جانے کی دعا مانگتی گڑگڑا رہی تھی۔

''ہاں گئی تھی میں، ان ماں بیٹیوں کے لچھن سدھارنے...... ارے شرم نہیں آتی ......لوگوں کے گھر اجاڑنے کا سامان کرتی پھر رہی ہے دن دہاڑے۔ ایسی بے شرم لڑکی تو دیکھی نہ سنی۔''

''کیا ہوگیا ہے امی آپ کو؟ آپ کی اپنی بھتیجی ہے وہ، آپ کا اپنا خون۔ اس پر اس طرح کا الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آپ خود بھی بیٹیوں والی ہیں۔''

''اے ہاں ہم بھی بیٹیوں والے ہیں مگر خدا گواہ ہے۔ ہماری بیٹیوں نے کسی پر نگاہ نہیں رکھی۔ جہاں باندھ دیا چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئیں نہ چوں نہ چرا ایک یہ ہیں۔ جوانی پھٹی جا رہی ہے......'' تائی امی کے زبان کے جوہر پہلی بار منہل پر کھلے تھے۔ اس کا منہ کھل گیا۔

''بس کریں امی!'' زین اس قدر زور سے دہاڑا کہ اسے لگا اس کا دل باہر آجائے گا۔ اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''اب ایک لفظ نہیں بولیے گا آپ۔ بہت کہہ چکیں اور بہت سن لیا میں نے۔'' اس کا چہرہ انگارے کے مانند دہک اٹھا۔ تائی امی اور منہل دونوں ہی اپنی جگہ سہم سی گئیں۔

''روبیشہ کے بارے میں کسی نے مجھ سے ایک لفظ بھی آئندہ کہا تو نتائج کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔'' اس کی آواز کسی دہاڑ سے مشابہ تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں گیا۔ اور پوری قوت سے دروازہ دے مارا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تائی امی اور منہل کسی خواب سے جاگی تھیں۔

☆☆☆

اسے اپنے وجود سے آگ کی لپٹیں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک وحشت کے عالم میں اس نے ٹائی گھسیٹ کر دور پھینکی۔ اس کی نگاہوں میں روبیشہ کا سرخ چہرہ گھوم رہا تھا۔

''کیوں آتے ہیں بار بار یہاں۔ جانتے نہیں ہیں سب کو برا لگتا ہے۔'' اس نے جبڑے بھینچ کر شرٹ کے بٹن کھولے اور بیڈ پر اچھال دی۔

''ایک بار مجھے ٹھکرا کر چین نہیں ملا کیا آپ کو۔ جو بار بار بے عزت کرنے......''

''او خدایا!'' اس نے فل اسپیڈ میں پنکھا چلا دیا۔

''وہ روئی تھی۔'' اس نے پورے جسم پر پسینے کی نمی محسوس کی۔

''وہ مجھ سے بدگمان تھی۔''

''اسے مجھ سے شکایت ہوئی...... ربا کو...... مجھ سے۔'' وہ اب اپنے جسم پر موجود بنیان گھسیٹ رہا تھا۔ پنکھے کی سرد ہوا خنک موسم میں جسم میں گھسنے لگی تھی مگر اس کا وجود کسی طور ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

''مت آیا کریں یہاں۔ جائیں یہاں سے۔''

کسی نے اس کے پردۂ سماعت پر انگارہ گرایا۔

''مت آیا کریں۔''

''چلے جائیں مت آیا کریں۔''

اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ واش روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں صرف روبیشہ کا چہرہ تھا۔ سرخ متورم۔ اس کے کانوں میں صرف روبیشہ کی آواز تھی...... رندھی ہوئی...... بیٹھی ہوئی...... چلاتی ہوئی۔

''مت آیا کریں یہاں۔'' وہ اب ٹھنڈے پانی کا شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا تھا۔ یخ پانی کی دھاریں اس کے وجود کو سرد کرتی جا رہی تھیں اور وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

ریحان صاحب بہت دیر سے اپنی بیگم کا کھویا کھویا سا انداز ملاحظہ کر رہے تھے۔ کتنی بار انہوں نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر چپ کر گئیں۔ بس صرف ایک گہری سانس بھرنے پر اکتفا کیا۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سینے پر الٹ کر رکھ لی۔

''یہی کہ بلال کا رشتہ لے جانے کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا؟'' بات تھی یا آہ۔ جو جانے کب سے دل میں دبی تھی۔

''تو آپ بالآخر اس بات پر راضی ہو ہی گئیں۔''

''کیا کرتی ہونا ہی پڑا۔'' ان کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ چونک سے گئے۔

''کیوں؟ کل تک تو آپ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھیں۔''

''ہاں...... بس'' انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''صالحہ نے کہا تھا صداقت بھائی سے کہلوانے کے لیے کہ وہ لوگ اس رشتے سے انکار کر دیں۔''

''کیا...... بات کر رہی ہیں آپ آمنہ؟ کیا ضرورت تھی یہ فضول بات کرنے کی۔'' ریحان ایک دم بگڑ سے گئے۔ آمنہ گڑبڑا گئیں۔

''میں نے کہاں......؟ بس صالحہ خود ہی کہہ رہی تھی تو میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

''حد کرتی ہیں آپ بھی۔ ایک باپ پہلے ہی بیٹیوں کو عید کے علاوہ شکل نہیں دکھاتا۔ اوپر سے آپ کہتی ہیں کہ ایک بیٹی کا رشتہ بچانے کے لیے دوسری بیٹی کے رشتے سے انکار کر دیں وہ؟'' ان کی بات غلط نہ تھی۔ آمنہ کے پاس سوائے ایک اور ٹھنڈی سانس بھرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

''انہوں نے بھی یہی کہا کہ میرے لیے تو دونوں ہی برابر ہیں۔''

''ہاں تو کیا غلط کہا انہوں نے۔ رویے بھلے غیر متوازن ہوں مگر اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔'' وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹتے ہوئے بولے۔

''میرے خیال میں یہ ویک اینڈ مناسب رہے گا۔''

☆☆☆

منگنی کی انگوٹھی بہت قیمتی اور خوبصورت تھی۔ بلاشبہ پہنانے والوں کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھی اور اس کی انگلی میں آ کر سج سی گئی تھی۔ اسے یہ انگوٹھی پہنے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ مگر جذبات اس حوالے سے بالکل سپاٹ سے تھے۔ اسے امی کا تمتماتا ہوا چہرہ اور نم آنکھیں یاد تھیں۔ ایسی ہی نمی اس نے شاید زین کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ جو بالکل اچانک بلال اور اس کے گھر والوں کی آمد کے بعد وہاں آیا تھا۔

مگر......

وہ وہاں آیا ہی کیوں تھا۔ کیسے......؟ کس لیے......؟ ایک بار روبیشہ سے سن لینے کے بعد اسے یقیناً دوبارہ پلٹ کر وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا وعدہ خلاف تو نہ تھا پھر......؟

''میں نے بلایا تھا اسے، تاکہ اپنی آنکھوں سے تمہاری نسبت ہوتی دیکھ لے اور پھر آئندہ تمہارا نام نہ لے۔'' اس کی سوچیں یمنیٰ نے پڑھ لی تھیں۔

اور وہ ایک دم ہی ہنس دی پھر دیر تک ہنستی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی نمی آن ٹھہری۔ جو اس نے زین کی بے یقین نگاہوں میں چمکتی دیکھی تھی۔

''تم کتنی ناوان ہو یمنیٰ! کتنی نادان...... تم سمجھتی ہو زین کو یہاں بلا کر انہیں میری منگنی کی رسم دکھا کر تم نے ان کے دل میں موجود میرے لیے جو جذبات ہیں ان کا سدِباب کر دیا ہے؟'' اس نے جیسے یمنیٰ کے بچپنے پر سر جھٹکا۔

''بالکل پاگل ہو تم۔'' آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا اور وہ نگلنے پر مجبور تھی۔

''معلوم نہیں کیوں...... کیوں سب لوگ ہمارے اتنے دشمن ہو گئے۔ وہ لوگ جو ہمارے اپنے تھے۔ کیا ملا انہیں ہمیں یوں دور دور دیکھ کر۔ ہم نے تو کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔'' وہ ایک عالم بے خودی میں بڑبڑاتی، بیڈ پر دم سادھے بیٹھ گئی۔ یمنیٰ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے آواز دی۔ مگر وہ اپنے آپ میں تھی کہاں۔

''کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا کسی سے ہم نے...... ہم نے تو...... ایک دوجے سے ایک دوسرے کا ساتھ تک نہیں مانگا۔ پھر کیوں...... کیوں سب ہمارے ایسے دشمن ہو گئے؟ ہمیں قریب دیکھ کر خفا ہمیں دور دیکھ کر خوش، راضی......''

''ربا!...... ربا......'' یمنیٰ نے گھبرا کر اس کا کندھا جھنجوڑا۔ مگر وہ سامنے جانے کون سے غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔

''ہم کون سا مر رہے تھے ایک ہونے کے لیے۔ ہم نے تو صبر ہی کر لیا تھا ناں۔ پھر کیوں تماشا بنانے لگے سب؟ کیا ملا سب کو یہ کر کے؟ جدا تو ہو گئے تھے ہم۔ مان تو لی تھی بات۔ مار تو لیا تھا دل پھر پھر...... پہلے تائی امی، پھر تم......''

''ربا ہوش کرو کچھ، کیا ہو گیا ہے؟'' اب کی بار یمنیٰ کی آواز بلند تھی۔ اس نے بنا چونکے یمنیٰ کی طرف چہرہ موڑا تو آنکھوں میں ٹھہرا پانی چھلک گیا۔

''کیا کیا انہوں نے؟ کیا، کیا تائی امی نے؟'' وہ یمنیٰ کے سوال پر چونک کر جیسے حواسوں میں لوٹی۔

''انہوں نے وہی کیا جو تم نے آج کیا۔ مگر وہ جیت گئیں۔ وہ بازی لے گئیں۔ تم جیت گئیں۔ سب لوگ جیت گئے ایک سوائے میرے۔ صرف میں ہار گئی۔ زین ہار گئے۔ بس...... بس ہم۔'' وہ بے وردی سے اپنے ہاتھوں میں پہنے گجرے کھسوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے سیاہ کشکول سے، تاریکی اور سناٹے کے سکے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے۔ اس کی بے نیند سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اور ان میں صرف ایک مانوس چہرہ آن سمایا تھا۔ کتنی حیرت اور بے یقینی تھی اس چہرے پر۔ کتنے سوال تھے اس کے خاموش لہجے میں۔ اور کتنا دکھ تھا اس معمولی سی نمی کی تہ میں...... اور وہ واپس چلا گیا۔ چچی کو مبارک باد دے کر۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کوئی جواب نہیں

مانگا۔ کوئی بات نہیں کی۔ اس کے پاس آ کر بیٹھا تک نہیں۔ اور رومیشہ کا سر جو جھکا تو اس کے بعد دوبارہ اٹھ ہی نہ سکا۔

اس کا دل تو تب سے ہی پگھل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے، قطرہ قطرہ، لمحہ لمحہ، نہ کل رات اور نہ آج، اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کل وہ واپس کب گیا۔ وہ اس کے بعد سب کچھ بھول گئی تھی۔ یمنیٰ کی چہکتی آواز...... بلال کے چہرے کے انگنت رنگ...... متوقع ساس اور سسر کا روکھا رویہ اور اکلوتی نند کی غیر موجودگی وہ بھی اتنے اہم موقع پر۔ کسی بھی دھیان کی راہ پکڑنے سے پہلے دو نم، حیران آنکھیں اس کے راستے میں کھڑی ہوئیں اور وہ خود سے نظریں چرانے لگی۔ موبائل کی اسکرین لمحہ بھر کو چمک کر بجھ گئی۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے مسکرا کر نہیں بلکہ بے تابی سے جھپٹ کر سیل اٹھایا تھا۔

''راستے تو جدا ہو ہی گئے لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا۔ اپنی خوشی میں شامل کرنے کے لیے ہی سہی۔ ایک بار یاد تو کیا ہوتا۔ تم جان لیتیں...... دوستی کسے کہتے ہیں۔''

اس کی پلکوں پر ٹکے آنسو رواں ہو گئے۔

''یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھول جائے۔''

یہ سیل بھی زین کا تحفہ تھا اور یہ سنگل بیڈ بھی۔ جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے دیوار میں نصب ہوئی جدید طرز کی رائٹنگ ٹیبل، لیمپ اور کتابوں کے ڈھیر میں حصہ بنی بیشتر کتابیں اسی کی یادگار تھیں۔ اس کے دستخط اور دعائیہ الفاظ سے جن کے سرورق جگمگاتے تھے۔

وہ سیل آف کر کے سینے پر رکھ کر بے اختیار سسک پڑی۔ جس سینے میں دھڑکتا دل اسی کے نام کی مالا جپتا تھا۔

''مجھے معاف کردیں زین جو بھی تکلیف آپ نے یمنیٰ کی وجہ سے اٹھائی اس کے لیے۔'' ٹوٹتے الفاظ، لبوں کو چومتے جا رہے تھے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کچھ دن پہلے زین کے لبوں سے نکلتے

فضاؤں میں تحلیل ہو گئے تھے۔
''مجھے معاف کردو رو بیشہ، جو بھی تکلیف تمہیں امی نے پہنچائی اس کے لیے۔''
☆☆☆
آج پتا نہیں کون سا دن تھا... زین العابدین اور منہل کی بات چیت بند ہوئے۔ وہ اس کے معمولات اور ضروریات کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھ رہی تھی لیکن زین ایک ''ہوں'' سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔ کئی بار اس نے سوچا، اس سے اس موضوع پر بات کرے یا کم سے کم اتنا ہی پوچھ لے کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ بہرحال وہ اس کا شوہر تھا اور ایک مشرقی بیوی کی طرح اس کی بے اعتنائی اسے جلاتی اور تڑپاتی تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اسے اچھی طرح پتا چل چکا تھا کہ اپنے شوہر کی سوچوں اور دل و دماغ پر وہ اکیلی ہی قابض نہیں۔ کوئی اور بھی پورے طمطراق سے وہاں براجمان ہے۔ یا پھر شاید وہ خود تو کہیں تھی ہی نہیں۔ ہر جگہ وہ ہی وہ تھی...... ''رو بیشہ......'' اس نے ایک حسرت سے اس کا نام لے کر دوسری طرف کروٹ لے کر سوتے ہوئے زین کو دیکھا۔ پھر کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیا سوچ کر دھیرے سے اس کا بازو ہلایا۔
''زین!......زین!''
وہ گہری نیند سے جاگا تو مُندی مُندی آنکھوں میں حیرانی سموئے اسے دیکھنے لگا۔ اور وہ اسے جگا تو چکی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے۔ اسے یوں نیند سے جگانے کی کیا وجہ بیان کرے۔ کوئی ایسی بات جو اس کا دل خوش کردے۔ یا کچھ ایسا کہ وہ مسکرادے۔ الفت کی نظر یا کرم کی کوئی ایک ساعت اس کے نصیب میں لکھ دے۔
''میں...... مجھے نیند نہیں آرہی۔'' وہ اٹکنے لگی۔
''تو......؟'' اس کا سوال اتنا ہی لاتعلق تھا جتنا کہ وہ خود۔
''میں نے سوچا آپ تھوڑی دیر...... میں...... میرے ساتھ جاگ لیں تو ہم باتیں کر لیتے۔''
آخری الفاظ پر اس کی آواز بالکل دم توڑ گئی۔
''نیند تمہیں نہیں آرہی اور جاگوں میں؟'' منہل کو لگا جیسے لمحے بھر کے لیے اس نے منہل کی ہنسی اڑائی۔ گویا پسِ عبارت کہیں ''تمہاری اوقات کیا ہے؟'' چھپا بیٹھا تھا۔
وہ سر جھکا کے لب کچلنے لگی۔ کسی ناکردہ جرم کے مانند اس نے زین کو جگانے کی غلطی کر ڈالی تھی۔
''کوئی سلیپنگ پلز لے لو۔ مجھے صبح آفس جانا ہے۔''
قیمتی مشورہ حاضر تھا۔
وہ کمبل منہ تک تان کر لیٹ چکا تھا۔
شادی کی پہلی رات کے علاوہ اس نے کبھی منہل کو اپنی اس ''خاص توجہ'' سے نہیں نوازا تھا جس کا ارمان اور جس کا تصور ہر نو بیاہتا کے چہرے پر گلال بکھیر دیتا ہے۔ جو سہاگن کے وجود کو گلاب کی طرح مہکا دیتا ہے۔
منہل کب تک اس پتھر کے وجود کو تکتی اپنی قسمت سے شکوہ کرتی۔ جلد یا بدیر اسے نیند آ ہی جاتی تھی۔ پلز کے بغیر بھی لیکن جب تک نیند نہ آئی۔ آنسو اس پر مہربان تھے۔ جانے کیوں بہتے آنسوؤں کی تپش تلے دل کے کسی پوشیدہ کونے میں کہیں کچھ بہت غلط ہو جانے کا احساس سر پھوڑائے سلگ رہا تھا۔
☆☆☆
بلال کو اس کا نمبر پہنچایا جا چکا تھا۔ یقیناً یہ یمنیٰ کی مہربانی تھی۔ جس کی خود اسے خواہش تھی نہ ضرورت۔ ہاں ایک مجبوری ضرور تھی۔ جو اسے نبھانی تھی۔ اس بات سے بے خبر یا جان بوجھ کر نگاہیں چرائے کہ یہ خیر خیریت، صبح و شب بخیر کے مختصر پیغامات چند لمحوں یا چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں اور مجبوری تاحیات کون نبھا سکتا ہے بھلا...... ایک نہ ایک دن، کسی نہ کسی کو تو ختم ہونا ہی پڑتا ہے۔ یا تو مجبوری...... یا اسے نبھانے والے کو خود......
ایک سرخ، سرد، اداس شام میں یمنیٰ آئی تو

مسکراہٹ اس کے لبوں پر دمک رہی تھی اور نگاہوں کی چمک خیرہ کن تھی۔

امی نے چٹا چٹ چوم کر اس کی نظر اتار ڈالی۔وہ ہونق بنی اس کا منہ تک رہی تھی جب انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی۔

''دیکھ کیا رہی ہو خیر سے خالہ بننے والی ہو۔خدا خیریت سے وہ دن دکھائے میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں اس سچی خوشی کو دیکھنے کے لیے۔''

انہوں نے کپکپاتے لبوں سے اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیں اور خود چائے بنانے اٹھ گئیں۔

دوسرے دن شام تک اس خوشی کو بانٹنے کچھ مہربان چلے آئے۔تائی امی اور منہل کی آمد نے اسے اس حد تک حیران کیا کہ وہ سلام کرنا ہی بھول گئی۔دل تو چاہا کہ وہیں سے پلٹ کر کمرے میں چلی جائے اور دروازہ بند کر کے اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک وہ واپس نہ چلی جائیں مگر دل پر کس کا زور...... لوگ کس طرح دوسروں کو اپنی نظروں سے گرا کر رشتے استوار کرنے چلے آتے ہیں۔

''اور ان کو یہ خبر دی کس نے؟'' یہ معما بھی ان ہی کی زبانی حل ہوا۔دوپہر کو آمنہ کے فون کرنے پر امی نے خوشی خوشی انہیں اپنی خوشی میں شریک کیا اور شام تک نمک پاشی کے اسباب سمیت احباب موجود تھے۔

''ارے دوسری سب باتیں بھلا کر خوشی منانے چلے آئے ہم تو۔'' انہیں اپنے گزشتہ رویے پر کوئی ندامت نہ تھی۔

''بس اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' امی حسبِ عادت مسکرائے گئیں۔

سالوں گزرے انہوں نے جیٹھانی سے کبھی تکرار نہیں کی تھی۔جب باقاعدہ ارادے کے ساتھ وہ روبیشہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے آئی تھیں تب بھی نہیں تو پھر اب اس مبارک موقع پر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ہر مہینے دھیان سے الٹرا ساؤنڈ کروانا۔ورنہ اپنی بہن کا قصہ تو یاد ہے ناں تمہیں۔'' تائی امی نے پٹاخا چھوڑا۔

''یا اللہ خیر......''

''میری بہن کے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہو۔'' اس نے بے اختیار دہل کر خدا سے دعا کی۔

''ہاں بھئی اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ہم تو خدا سے یہی دعا کرتے ہیں بس۔'' روبیشہ کو ایک فیصد بھی یقین نہ تھا۔نہ ان کی باتوں پر نہ ان کی دعاؤں پر۔

کہر آلود شام کو اندھیرے نگل رہے تھے۔ برآمدے میں پلنگ کے پائے سے لپٹی صبغہ اپنا سر کھجا رہی تھی۔اس نے سردی کی شدت میں اضافے کو محسوس کر کے اسے اندر لے جانا چاہا تو اس کے پیر سے بندھی زنجیر نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔

☆☆☆

وقت سست رفتاری سے گزرا مگر، بہرحال...... اسے بلال کی خبر گیری کی عادت پڑ ہی گئی۔خوش ہوئے بغیر وہ اس کے ایس ایم ایس اور کال کی منتظر رہنے لگی۔

زین تو اس دن کے بعد سے پلٹ کر نہیں آیا۔ بس وہ آخری پیغام اور اس سے جڑی طویل خاموشی ایک ایسا زخم تھا جو معمولی سی یاد کی ٹھیس سے پکنے لگتا۔ رِسنے لگتا اور ایسے میں بلال کو زبردستی سوچنا نکال نکال کر اس کے میسجز پڑھنا...... ایک پین کلر کے مانند۔ ایک درد کُشا کے بہلاوے کی طرح۔درد کشا...... جس کا زخم کی گہرائی اور اس کی نوعیت سے اتنا واسطہ نہیں ہوتا لیکن وہ زخم کھانے والے کو وقتی طور پر درد سے نجات دلا کر ایک پُرسکون غنودگی میں دھکیل دیتا ہے۔

ایسا ہی ایک درد کشا منہل کو چاہیے تھا۔اپنے شریکِ سفر کی بے رخی، بے اعتنائی کاٹنے کے لیے۔ ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا عذاب بھوگنے کے لیے اور اس کے پاس اس کی تنہائی کے رفیق فی الحال یہ سناٹے اور خاموشی ہی تھی۔

وہ اکیلے ان بدنما، عفریت نما دوستوں سے نبرد آزما تھی اور زین چپ چاپ اپنے کام میں گم۔

وہ آزمائش کی کن گتھیوں سے الجھ رہی تھی اسے خود بھی نہیں پتا تھا۔

وہ کسے آزما رہی تھی۔ خود کو، اپنے ضبط کو یا زین کی محبت کو جو کسی اور کے در پر تشنہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

آگہی کا ناگ جو لاشعور سے شعور کے درمیان کھنچے باریک حاشیے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اسے تب ڈستا جب وہ ادراک کے دروازے کھولتی اور یہ کواڑ تو ایک نہ ایک دن وا ہونے ہی تھے پھر وہ دن جلد ہی آن پہنچا۔

تائی امی یمنیٰ کی خوشخبری کی مبارکباد دے کر آنے کے بعد سے ہی اسے ٹٹول رہی تھیں۔ اٹھتے بیٹھے، کھاتے پیتے چلتے ہوئے وہ ان کی نظریں خود پر محسوس کرتی جز بز ہوتی رہتی۔

''کتنے ہفتے ہو گئے شادی کو اب تک کوئی خوشی کی خبر نہیں سنائی تم نے۔'' انہوں نے بہت نرمی اور سبھاؤ سے بات شروع کی تھی۔ وہ اسی وقت فون پر بیرونِ ملک مقیم اپنی بیٹی سے بات کر کے اس موضوع پر مشاورت کر کے بیٹھی تھیں۔

''جی!'' منہل بات کو یہیں تک رکھنا چاہتی تھی۔

''جی..... کیا جی'' انہوں نے حیرت سے گھورا۔

''کل چلنا میرے ساتھ۔'' بالکل اچانک فیصلہ ہوا۔

''کیوں؟'' وہ ہکا بکا سی ہو گئی۔

''ارے چیک اپ کراؤں گی تمہارا اور کیوں۔''

''لیکن کیوں..... کس لیے؟''

''لو جیسے تمہیں کچھ پتا نہیں۔ اتنے مہینے ہو گئے شادی کو اور بچے کی آمد کے کوئی آثار ہی نہیں۔ آج کل ویسے ہی زمانہ خراب ہے۔ نت نئی بیماریاں سن لو آئے دن بیٹھے بٹھائے۔'' تائی امی ناگواری سے بولتی چلی جا رہی تھیں۔

''لیکن میں کوئی بیمار نہیں ہوں۔'' وہ غصے کے مارے اتنا ہی بول سکی۔

''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اچھی بھلی عورتیں شادی کے بعد بانجھ نکلتی ہیں۔ یہ تو ڈاکٹر ہی بتائے گی۔''

''کیا بتائے گی ڈاکٹر؟ میرے بانجھ پن کی تصدیق کرے گی وہ..... تو سن لیں کان کھول کر۔ میں بانجھ نہیں ہوں گی اور محرومی آپ کے بیٹے میں ہے۔ سنا آپ نے۔''

''ہیں..... کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی.....؟'' وہ اچھل ہی تو پڑیں۔

''جی، ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ پوچھیے اس سے جا کر۔ اگر میری بات غلط ہے تو اتنے مہینوں سے.....''

بات کچھ مکمل کرتے، کچھ نہ کرتے اس کی آواز، انا، نسوانیت سب ریت کا ڈھیر بن گیا۔ اور آنسوؤں کے سیلاب میں یہ ریت بہہ ہی جاتی لیکن وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔

تائی امی گنگ تھیں۔ حیرت سے یا شاید صدمے سے۔

☆☆☆

بلال کے بالکل اچانک ہی باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ وہ دل میں اٹھتے اداسی کے احساسات کو کچلنے کا سوچ کر ہی دنگ رہ گئی۔

''محبت رنگ بدلتی ہے۔''

اس نے سنا تھا کبھی۔ اب شاید اس تجربے سے گزرنے کا وقت آیا ہی چاہتا تھا۔ جبھی اس نے جانے سے پہلے ایک بار رُبا سے اپنے آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

''دوپہر کے کھانے میں ذرا اہتمام کر لینا۔ باہر چلا گیا تو جانے کب واپسی ہو گی۔'' امی نے کہا۔

کباب، بریانی، کوفتے، ٹرائفل اور چائنیز سوپ۔ اس اہتمام میں سب ہی کچھ شامل تھا۔ چاہے ایک فرد کے لیے ہی سہی لیکن اسے مستقل ایسا لگتا رہا جیسے سب کچھ اوپری سا ہے۔

''اور اگر اسی جگہ آج زین کو آنا ہوتا یا زین مجھے چھوڑ کر جا رہے ہوتے تو.....؟'' ایک خیال بڑا بے موقع چبھ گیا۔ گرم گرم سوپ چمچے سے اس کے ہاتھ پر ٹپک گیا۔

اس نے ''سی'' کی آواز کے ساتھ ہاتھ مل کے نیچے کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں ایک ننھا سا آبلہ بن چکا تھا۔

وہ کئی لمحے اس آبلے کو دیکھتی اسے زین کی یاد سے جُڑے تحفے سے تعبیر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ بیل بج اٹھی۔

امی نے دروازہ کھولا تھا۔ اسے لاؤنج سے بلال کے دھیرے دھیرے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور اپنے کمرے سے صبغہ کے چلّانے کی بھی۔ اسے رات سے شدید بخار تھا۔

''مجھے بھی جا کر سلام کرنا چاہیے۔''

ہر مرحلہ ایک پُرسوچ آزمائش بن چکا تھا۔ (اور بھلا پوری زندگی آزمائش میں گزاری جاسکتی ہے؟ جانی بوجھی آزمائش)

''ایک شخص کے بدلنے سے کیا کچھ بدل چکا تھا۔ کہاں کہاں، کس کس جگہ۔'' اس نے گہری سانس لے کر قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

بلال کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ایک واضح چمک آئی۔ یا شاید اس کی آنکھیں چمکدار ہی ہوں گی۔ اس وقت چمک بڑھ گئی تھی اور اس چمک کا عکس چہرے پر جھلملا کر اسے روشن کر رہا تھا۔

''کیسی ہو ربا؟'' الفاظ کے سوا سب ہی کچھ مختلف تھا...... آواز، لہجہ اور انہیں ادا کرنے والا۔

وہ ''ٹھیک اور خیریت'' کی رسم کے درمیان معلّق ہوئی جا رہی تھی کہ کمرے سے یکدم صبغہ کے چیخنے کی آواز آئی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ پل میں لپک کر اندر چلی گئی۔ اور وہ پل کے لیے بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی۔ اسے جلدی واپس جانا تھا۔ اس لیے جلد ہی کھانا چُن دیا گیا۔

وہ پہلی بار اپنی ہونے والی سسرال یوں تنہا آیا تھا۔ وہ بھی گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اس کے خیال میں امی یا بابا اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ اکیلے یہاں آئے۔ لیکن دراصل وہ اکیلے ہی آنا چاہتا تھا تاکہ من چاہی ہستی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار سکے۔

کھانا مزیدار تھا۔ اور پھر یادگار بھی ہو گیا۔

روبیشہ بالکل سامنے ہی تو بیٹھی تھی۔ رکی رکی سی، نیچی نظریں، دھیمی دھیمی آواز لہجہ اور انداز۔ ایک مسحور کُن احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا سادہ چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اسے تکتے ہوئے، وہ اپنے برابر میں بیٹھی اس کی تواضع کا دھیان کرتی امینہ بیگم کو بھی بھول گیا۔ جبھی ایک سوچ......

''اگر زین بھائی دیوانے تھے بھی تو، یونہی تو نہیں ہوں گے۔'' ایکا ایکی دل میں ابھرنے والے اس خیال نے لحظہ بھر کے لیے اسے دنگ کیا پھر مضطرب......

ابھی وہ خود کو پیش کی جانے والی تاویل کی پھسلتی ڈور کو سنبھال ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اس نے یونہی بے دھیانی میں مڑ کر دیکھا۔ اور پھر جیسے ایک دم ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ کون تھی؟ روکھے بے ترتیب بال۔ بڑے بڑے باہر کو ابلتے دیدے دبے ہونٹوں کے کناروں سے نکلتی رال اور عجیب بھاری اور ڈراؤنی آواز۔ اسے لگا، اس کا دل سینے سے باہر نکلتے نکلتے بچا ہے۔

''ارے صبغہ۔ تم کہاں آگئیں یہاں۔'' ربا نے ایک دم بڑھ کر اسے سنبھال لیا پھر برابر میں بٹھا لیا۔ بلال نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور نظر چرا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

''گھبراؤ نہیں یہ کچھ نہیں کہے گی تمہیں۔'' امینہ بیگم نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی تھی۔ وہ جھینپ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

روبیشہ اب خود کھانے کے بجائے اسے کھلا رہی تھی۔ وہ ایک چمچہ سوپ لے کر اس کے منہ میں ڈالتی پھر، باچھوں سے بہہ نکلنے والا لعاب کپڑے سے صاف کرتی۔

بلال کے لیے کھانا مشکل ہو گیا۔ اسے بے اختیار

گھن آنے لگی۔ اس نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور پھر مزید اصرار کے باوجود اور نہیں کھا سکا۔

روبیشہ جانتی تھی یہی ہوگا۔ اس نے بلال کا ردِعمل دیکھنے کے لیے صبغہ کو وہاں بٹھایا تھا۔ اور اس کا ردِعمل اس کی توقع سے مختلف نہ تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار دکھ نے سر اٹھایا اور کسی احساسِ زیاں نے بھی۔

زین نے آج تک کبھی صبغہ سے گھن کھائی تھی نہ خوف۔ وہ ہمیشہ بہت آرام سے اسے چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ اور بلال ابھی تک اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر جھرجھری لے رہا تھا۔

''اوہ خدایا!''

بلال کے دل سے بار بار صدا نکلتی۔

''یہ روبیشہ سے اس قدر مشابہہ کیوں ہے؟''

اس کی نظر اڑ اڑ کر ان دونوں پر پڑتی رہی، جب تک کہ روبیشہ وہاں سے اٹھ کر چلی نہ گئی۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر صبغہ کو وہیں چھوڑ دیا۔

''جب زندگی بھر کا ناتا جڑنے جا رہا ہے۔ تو بہتر ہوگا کہ وہ مجھے اور مجھ سے جڑے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح پرکھ لے۔'' اس کی سوچ تھی۔

اسے چائے پکڑا کر واپس آتے ہوئے اس نے بلال کے چہرے پر کراہیت دیکھی۔ اس کا دل نئے سرے سے دکھا۔

ابھی وہ اسی خیال میں گم چائے کی کیتلی سنک میں رکھے اسے گھور رہی تھی۔ جب اس نے صبغہ کی آواز سنی۔ وہ زور زور سے اسے بلا رہی تھی۔ اماں جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ پھرتی سے پلٹ کر کچن سے نکلتے نکلتے اسے بلال بھی آواز دے چکا تھا۔

صبغہ اس کا ہاتھ مٹھی میں دبوچے بری طرح کھینچ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ اور ساسر تھی۔ جسے وہ بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کوشش ناکام رہی اور گرم چائے اس کی سفید بے داغ شرٹ پر الٹ گئی۔ چائے بے حد گرم تھی۔ یقیناً اسے تکلیف ہوئی ہوگی۔ روبیشہ نے بے اختیار زبان دانتوں میں دبالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبغہ کو روکتی یا کچھ کرتی۔ بلال نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کے صبغہ کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

''ہا......'' روبیشہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

صبغہ کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہلچل مچاتے منظر پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ بری طرح الٹ کر پیچھے گری۔

''صبغہ......صوبی میری جان۔''

روبیشہ کا دل جیسے کسی نے بھاری بوٹ تلے مسل دیا۔ وہ لپک کر بہن کو اٹھانے لگی۔ صبغہ کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ عجیب وغریب انداز میں بھونڈی سی آواز میں دھیرے دھیرے رونے لگی۔ روبیشہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ بلال کو اس نے یکسر نظرانداز کر دیا تھا۔ بلال چند لمحے کوفت زدہ انداز میں اسے اپنی جڑواں ایبنارمل بہن کو پیار کرتے دیکھتا رہا پھر اپنی سفید شرٹ پر پڑے بدنما داغ دیکھتا ہوا سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل کر منڈیروں پر سمٹ گئی تھی۔ زرد، اداس اکیلی دوپہر۔ اسے اپنے وجود میں اور اس دم توڑتی دوپہر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ عزتِ نفس کی موت اگر انسان کی اپنی موت ہوتی تو وہ کب کی مر چکی ہوتی۔

''بانجھ......بیٹے سے پوچھیں۔''

ادھوری پرچھائیاں......

''مجھے کوئی بیماری نہیں۔'' بولتا لہجہ اور بدلتا منظر۔ خون آشام جڑیلی، سوکھی بیلیں، تندوتیز ہواؤں کے جھکڑ میں ڈولتی......

''بانجھ ہے یہ...... یہ ہے بانجھ۔ اتنے...... کتنے...... کتنے مہینے ہوگئے ہیں؟''

غصے میں چیختی چلاتی انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتی......

وہ اس منظر میں موجود ہی نہیں تھی۔ جہاں وہ تھی،

وہ تو کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

گھنا، تاریک، تنہا، جنگل..... کالی گھور سیاہ رات.....اور سر سے زمین تک لٹکتی سیاہ بیلیں جن میں کوئی پتہ نہ تھا، کوئی پھول نہ تھا، فقط سرنگیں سیاہ..... جن کے نوکیلے ابھری نیلی رگوں والے ہاتھ لمبے ہوکر فضا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے بازوؤں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ اس کے وجود سے لپٹ کر اسے بے بس کر رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ تبھی کہ تبھی......

''دھپ'' کوئی چیز اس کے برابر میں آکر گری۔ اس کی چمٹی ہوئی پلکیں جھپک گئیں۔ اس نے چونک کر برابر میں دیکھا۔

''یہ کچھ کتابیں ہیں۔ تمہیں رات میں نیند نہیں آرہی تھی ناں آج بھی شکایت ہو تو...... پڑھ لینا وقت اچھا گزرے گا۔''

اس کی اجنبی نظریں مانوس خدوخال پر ٹھہری تھیں اور وہ اندر جا چکا تھا۔ اسے لگا اسے یہیں بیٹھے بیٹھے رات بتا دینی چاہیے۔

جانے کتنا وقت گزرا تھا۔ وہ ڈراؤنا خواب دیکھتے، دیکھتے۔

عصر سے عشاء کا وقت ہونے کو آیا۔ جب کھلی آنکھوں میں چلتا خواب ٹوٹا بھی تو اسی دشمنِ جاں کی آواز پر جو اس کا سکون غارت کر کے اب بیڈ روم میں بند ہو چکا تھا۔

تائی امی کا موڈ جانے کس بات پر خراب تھا۔ دوپہر میں زین کی چھوٹی بہن اپنے میکے کا چکر لگا کر گئی تھی۔ وہ تبھی سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔

تو یہ طے ہے کہ آج کے دن کا آخری کھانا بھی مجھے تنہا زہر مار کرنا ہے۔ دوپہر میں بھی ساس امی نے اپنی بیٹی کے ساتھ دوپہر کا کھانا اپنے کمرے میں ہی کھالیا تھا۔

اس کا جی ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا۔ جی چاہا ایک ہاتھ مار کر سجی سجائی ٹیبل الٹ دے۔ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ تو نہ پہنا سکی۔ لیکن کمرے میں زین وقت سے کہیں پہلے خدا جانے سو رہا تھا یا سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اس نے جا کر بری طرح جھنجوڑ دیا۔

''کیا بات ہے؟ کیا مصیبت ہے؟''

''میرے اندر آگ لگی ہے۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

''بھانبڑ جل رہے ہیں۔ عزت داؤ پر لگی ہے اور تم یہاں پڑے سو رہے ہو۔'' آخر میں اس کی آواز چیخ میں بدل گئی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''اور سمجھ آئے گا بھی نہیں۔ اس منحوس کی پٹی آنکھوں سے اترے گی تب ناں۔''

''کون؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''روبیشہ!''

''ہاں اسی ڈائن کی بات کر رہی ہوں میں۔''

اس وقت وہ خود کسی بلا کی طرح اسے نیند سے جگا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوگئی تھی۔ زین لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکدم اس کا بازو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

''ڈائن وہ نہیں، ڈائن تم ہو تم۔ ایسی ڈائن جس نے میرے خوابوں کو کھالیا، میری خواہشوں کو نگل لیا، میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو ختم کر دیا تم نے اور اگر تھوڑے دن تم اور یہاں رہو گی تو ایک دن، مجھے بھی ختم کر دو گی۔''

چبا چبا کر بولتا وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر اٹھا تھا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں پیچھے کو لڑکھڑائی اور وہ تیزی سے اٹھ کر چپلیں گھسیٹتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کتنی صدیاں بیتی تھیں۔ کتنے زمانے گزرے تھے۔ جانے کتنا وقت باقی تھا صبح صادق کے آثار نمودار ہونے میں۔ زیست پر چھائی کالی رات ٹلتی نظر نہ آتی تھی۔ صبح کا ستارہ ناامیدی کی گود میں جا سویا تھا۔ جلتی آنکھیں، بھیگے لب، کسی نقصان کا نوحہ پڑھ رہے تھے۔

گہری بدلیوں نے چاند کے چہرے پر نقاب ڈال دیا تھا۔ اس کے دل کی طرح بھرے بھرے بادل کسی بھی لمحے برس پڑنے کو بے تاب تھے۔ تن تنہا...... خالی کمرا، ویران وجود، بے شکن بستر۔ سب اس کی بربادی میں برابر کا غم بانٹنے کو تیار تھے۔

جبھی کمرے میں رقص کرتی وحشت کے گھنگرو تھمے اور سناٹے نے ہانپتے ہوئے سانس بھری۔

ایک مانوس سی موسیقی کمرے میں جاگ رہی تھی۔ ایک بار، دوبار... اس نے جھنجلا کر سیل اٹھایا۔ زین کے موبائل پر روبیشہ کا نمبر دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس موبائل کو سامنے دیوار پر پوری قوت سے دے مارے مگر...... جانے کس خیال نے دستک دی تھی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''زین...... زین آپ پلیز گھر آجائیں۔ صوبی کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ اسے شام سے فٹس پڑ پڑ کے حالت خراب ہوگئی ہے۔ شدید بخار چڑھ گیا ہے پلیز آجائیں۔''

وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ ایسا جو اس کے اندر جلتے الاؤ پر سرد چھینٹے ڈال دے۔ جو اس کے اندر بھری نفرت اور غصے کو ایک جملے میں اس پر انڈیل دے۔ جیسے اس کی اپنی نیندیں جل اٹھی تھیں۔ ویسے ہی اس کی نیندیں بھی جہنم رسید کر دے لیکن وہ تو پہلے ہی رو رہی تھی۔ منہل کو قرار سا ملنے لگا۔ وہ مضطرب تھی۔ زین کو پکار رہی تھی... بلا رہی تھی مگر...... زین تو......

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

اس کے خیال میں اسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات مکمل کرتے ہی لائن کٹ گئی۔ کال پھر آنے لگی۔

''کہاں ہیں زین! پلیز ان سے کہیں گھر آجائیں۔''

''کیسے کہہ دوں جب وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔''

''دیکھیں میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ باہر بہت شدید بارش ہے۔ ورنہ میں اکیلی اسے اسپتال لے جاتی۔ ابو اور ان کی فیملی بھی یہاں نہیں۔ پلیز میری زین سے بات کروا دیں۔ ایک بار خدا کے لیے......''

اس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

''تمہیں ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی۔ نہیں ہے وہ یہاں اور اب فون مت کرنا۔'' اس نے سختی سے بات کر کے فون سرہانے کی طرف اچھال دیا اور واش روم میں جا کر منہ پر یخ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

جلتی آنکھوں کو ذرا سا سکون دے کر جب باہر نکلی تو سیل متواتر بج رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں موبائل آف کر کے سائڈ ٹیبل کی سب سے نچلی دراز میں پھینک دیا۔

☆☆☆

اگلے دن کی صبح کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ پاس پڑوس کی عورتوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ گھر کا سامان باہر نکالا جا رہا تھا۔ دن چڑھا اور سورج کی ادھ مری تپش آنگن تک آئی، تو چاندنیوں اور سپاروں کے انتظامات کیے جانے لگے۔

جن بازوؤں نے آخری وقت میں اسے سمیٹا تھا۔ وہی بازو گھٹنوں پر لپیٹے۔ ان میں منہ چھپائے وہ کب سے خاموش سب سے پرلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

آہیں، آوازیں، سوگواریت، دنیا، لوگ...... ہر چیز سے چھپنا چاہتی تھی وہ۔ کہیں کسی اندھیرے کونے میں دور بہت دور۔ جہاں کوئی آواز اس تک نہ پہنچے۔ کوئی زندگی کا احساس دلاتی چیز نہ سنائی دے، نہ دکھائی دے، نہ محسوس ہو...... کوئی جنبش نہیں...... کوئی سانس، کوئی دھڑکن تک نہیں۔

میت کو غسل دیا جا چکا تھا۔ رشتے دار جمع ہو گئے تھے۔ خواتین، اماں کے سسکتے وجود کو دلاسا دینے کے لیے لپٹاتیں۔ یمنیٰ کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔ جب کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔

''بہن کو دیکھ لو بیٹی، آخری بار''

آواز اداسی میں ملفوف ادھوری رہ گئی۔

"آخری بار" اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔
پتھرائی آنکھوں سے سامنے سفید لباس میں لپٹی بے جان مورت کو دیکھا۔ پھر اس کے پاس، سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

بال نظر نہیں آتے تھے۔ عیب وار آنکھیں...... پپوٹوں تلے چھپ گئی تھیں۔ لب خاموش، خشک شاید آج سے پہلے وہ کبھی اتنی صاف ستھری اور پاکیزہ نہیں لگی تھی۔ صاف ستھری پاکیزہ لیکن بے جان۔ ہو بہو اس کی شکل۔ اُسی کا قد بت...... اس کی جڑواں بہن...... وجود کا حصہ۔

ایک آنسو اپنی بے قدری کا احساس لپیٹ کر پلکوں کی دہلیز سے نکلا اور رزقِ خاک ہو گیا۔ کتنے گھنٹوں سے باندھا گیا بند ٹوٹ گیا اور نمکین سیلاب بہہ نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اس سے لپٹ رہی تھی۔ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔

جبھی برسوں کے بعد، جانے کتنے زمانوں کے بعد صداقت علی اور ان کے بالکل پیچھے زین العابدین نے گھر میں قدم رکھا۔

اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں اٹھائیں۔ کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے صحن کے وسط میں وہ اور اس کے پیچھے منہل...... وہ اٹھی اور باہر نکلی آگے بڑھتے صداقت علی کو نظر انداز کرتی سیدھی زین کے سامنے پہنچ گئی۔

زین نے اسے اپنے سامنے حال سے بے حال کھڑے دیکھا۔ اور اس کے سینے میں کسی نے بھالا اتار دیا۔

"اب آئے ہیں آپ یہاں اتنی دیر لگا کر؟ کہاں تھے کل رات سے؟ کتنا بلایا میں نے۔ میری بہن چلی گئی مجھے چھوڑ کر زین...... سب کو بوجھ لگتی تھی وہ۔ سب اس کے زندہ رہنے سے تکلیف میں تھے۔ مگر آپ تو ایسے نہیں تھے۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیوں نہیں آئے آپ؟ کتنا بلایا میں نے، کہاں تھے آپ؟ کیوں نہیں آئے؟"

بے تحاشا روتے ہوئے وہ ان کا گریبان تھام کر، جیسے دنیا جہان بھلا کر کسی اپنے سے اپنا غم کہہ رہی تھی۔ دو قدم پر کھڑے صداقت علی کی ہمت نہ تھی کہ اسے روک لیتے۔

کمرے کے اندر باہر...... گھر کے پورے منظر پر جمود طاری تھا۔ ان کے ساتھ کھڑے دو خاندانوں نے جدا جدا تاثرات سے یہ منظر دیکھا۔ ان میں بلال بھی شامل تھا اور ہانیہ بھی۔ تائی امی بھی تھیں اور منہل بھی۔ لیکن آج اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ پھٹے بانس کی طرح بیٹھی آواز اور خراش زدہ حلق کے ساتھ زور زور سے روتی وہ صرف زین کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے شکوہ کر رہی تھی۔ جو اسے سنبھالتے، سمیٹتے بے بس ہوا جا رہا تھا۔ بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ان ہی مہربان بازوؤں میں ہوش و حواس سے بے بہرہ ہو گئی۔ جن کا سہارا لینا اس کے نصیب میں نہ تھا اور وہ اپنے نصیب سے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

زیست کیسا کیسا وقت سامنے لاتی ہے۔ کڑا سماں، مشکل لمحات، کٹھن مرحلے...... انسان جانتے بوجھتے کسی منظر سے چرا کر آنکھیں بند کرتا ہے۔ پھر بند آنکھوں کے پیچھے اسی منظر سے گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر بند کرتا ہے، جھٹلاتا ہے، جھنجلاتا ہے، شعور کی تیز نوکیلی آواز کو ان سنا کرتا ہے۔ بہرہ بن جاتا ہے۔ لیکن سچائی کسی عینک کی طرح ادراک کے دونوں اطراف کمانیاں اڑا کر بیٹھ جاتی ہے۔ دائیں بائیں اوپر نیچے اسے کتنا ہی ہٹانے کی کوشش کرو وہ شعور کی آنکھ سے چپکی ہی رہتی ہے۔ تاوقتیکہ انسان اپنی تمام انا، ضد اور بعض اوقات عزت کو بھی بالائے طاق رکھ کر اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی منظر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

ایک جلتا ہوا منظر، ایک سلگتی ہوئی حقیقت، جس نے پچھلے چند ایک سال سے سجائے ہوئے اپنے تئیں تمام سپنے اور ارمان، ایک طنزیہ ہنسی اور پاؤں کی

حقارت بھری ٹھوکر سے ہوا میں اڑا دیے تھے۔
اپنے دل کی سنتے، سنتے وہ جس حقیقت سے نظریں چرا کر اسے جھٹلانے چلا تھا۔ اب وہ حقیقت اپنے چہرے پر کڑوی آگہی مل کے، پوری آنکھیں کھول کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ نہ کوئی جائے پناہ تھی نہ راہِ فرار۔ بس چند آوازیں تھیں۔ چھل پیریوں کی طرح تعاقب کرتی۔ راستے میں کھڑی کالی بلی کی طرح۔

''میں نے آپ کو بلایا تھا۔ آپ کیوں نہیں آئے۔''

''سب کو اس سے تکلیف تھی سوائے آپ کے۔''
یہ سن کر تو بلال کو وہیں صحن میں ہی سرما کی دھوپ میں پت جھڑ کی زردی گھلتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے روبیشہ نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا ہو۔

☆☆☆

امینہ بیگم کے لیے یہ دن پوری زندگی سے زیادہ بھاری تھے۔ جب صداقت علی ان کے گھر میں روز ہی تشریف لا رہے تھے۔ دنیا کی عورتوں کے لیے ان کے مرد سے بڑھ کر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ وہ کیسے خاوند تھے کہ ان کی آمد اور موجودگی نے امینہ بیگم کے دکھ کو دگنا کر دیا تھا۔ ان کے دل کا بوجھ اور بڑھا دیا تھا۔ پہلے دن سے لگی آنسوؤں کی جھڑی اب تک نہ ٹھہری تھی۔ اور سر کا درد گھر کے افراد کی طرح مکین تھا۔
بالآخر بہت سوچ سمجھ کر اور وقت کے ساتھ وہ اپنے باپ کے روبرو تھی۔
''آپ اپنے گھر چلے جائیں واپس۔'' نظریں زمین میں گاڑے اس نے پتھر سے لڑھکائے۔ صداقت علی ایک دم اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی نظروں میں حیرت اور بے یقینی ثبت تھی۔
''بیٹی میں بہت شرمندہ......''
''برائے مہربانی'' اس نے نرمی سے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹی۔

''ہم ان بھاری الفاظ کے قابل نہیں۔ بس آپ آئندہ تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔ ہمارا خرچہ اٹھا کر پہلے ہی آپ نے ہمیں اپنے احسانات کے بوجھ تلے دبا رکھا ہے۔ اب اگر مزید آپ یہاں رک بھی گئے تو اس احسان کے بوجھ سے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔'' اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ آنکھوں میں جلن اور نمی بڑھ گئی۔
''ایسا مت کہو بیٹا۔ میری بات تو سنو۔''
''آپ میری بات سن لیں میں اپنی بہن کو کھو چکی ہوں، ماں کو کھونے کی ہمت نہیں۔ اور ویسے بھی ہم آپ کے بغیر جینا سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں آپ کی عادت نہیں رہی۔''
بیرونی دروازے سے داخل ہوتے زین نے روبیشہ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔ چچا تھکے، تھکے برآمدے سے باہر نکل کر صحن میں آئے تھے۔
وہ لمحہ بھر کے لیے زین کے قریب ٹھہرے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گئے۔ ان کی آنکھوں میں امڈتی نمی زین کی نظروں سے مخفی نہیں رہی تھی۔
زین نے ایک بڑی محرومی کا دکھ ازسرِنو اپنے بائیں پہلو میں کروٹیں لیتا محسوس کیا۔ اس نمی میں کیا کچھ تھا۔ شاید افسوس، شاید پچھتاوا یا شاید صرف جذباتیت۔ وہ خود بھی چپ چاپ ہاتھوں میں کپڑے، دواؤں اور پھلوں کے شاپرز برآمدے میں ٹیبل پر رکھ کر واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

منہل چلی گئی۔
تائی امی کو آئینہ دکھا کر۔ زین کے سامنے اعترافِ جرم کر کے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔
''اس رات آپ کے جانے کے بعد......'' وہ جانتی تھی۔ زین واقف ہو چکا تھا۔
اس طوفانی رات کی صبح جب اس نے اپنا موبائل

فون تلاش کیا تو وہ اسے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں آف پڑا ہوا ملا۔ وہ خود تو فون وہاں نہیں رکھ کر گیا تھا۔ ظاہر ہے کسی نے جان بوجھ کے ہی وہاں ڈالا تھا۔ فون آن کرتے ہی ربا کی ڈھیروں مسڈ کالز اور میسجز نے ساری حقیقت اس کے سامنے عیاں کر دی تھی۔ بعد میں اس ہی نے صداقت اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دی تھی۔ لیکن اس نے منہل سے کوئی بھی سوال نہیں کیا تھا۔ کوئی باز پرس نہ کی تھی۔ منہل کی سزا کے لیے اس کے ضمیر کی چبھن ہی کافی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں غصے میں بالکل اندھی، بہری بن گئی تھی۔'' وہ سر جھکائے سسک رہی تھی۔

زین نے تب بھی کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کے بندھے ہاتھ کھول کر، اس کے آنسو صاف کر دیے اور تھکے ماندے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔

تب وہ اٹھی اور اپنا سامان سمیٹ کر ساس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''آپ تو ماں ہیں اور ماں اپنی اولاد کی ہر تکلیف، ہر خوشی، ہر خواہش کو سمجھ لیتی ہے پہچان لیتی ہے...... اس وقت سے جب اسے ہنسنا اور رونے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ پھر آپ کیوں نہیں سمجھ سکیں اس کے دل کی خواہش کو؟ اس کی آرزو کی گہرائی کو ناپ کیوں نہیں سکیں امی؟''

تائی امی حیرت زدہ و نادم سی اسے سن رہی تھیں۔

''اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ سنبھل جائیں۔ سمجھ جائیں۔ وہ گھل رہے ہیں، اندر ہی اندر جل رہے ہیں۔ یہ زبردستی کا ساتھ نہیں نبھا پائیں گے۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتے۔ وہ روبیشہ سے ملتے نہیں۔ اسے دیکھتے تک نہیں۔ اس کی آواز بھی نہیں سنتے مگر اس کے ساتھ ہوتے ہیں ہر وقت۔ فضول کے واہموں میں گھر کر اپنی اولاد کو اس عذاب میں مزید مت تڑپائیں۔ پتا نہیں آپ کو اتنے سالوں میں کیوں نظر نہیں آیا وہ سب، جو میں نے فقط ایک منظر میں دیکھ لیا۔ وہ سب جو آپ کو سالوں پہلے نظر آ جانا چاہیے تھا اور رہی میں؟ تو مجھ میں کوئی کمی نہیں، کوئی خامی نہیں۔ کوئی عیب نہیں...... پھر میں کیوں زبردستی ایک ایسے شخص کے سر پر سوار رہوں جو دانستہ یا نادانستہ میری ذات کی نفی کر کے خود تو ندامت سہے گا ہی، مجھے بھی نفسیاتی مریض بنا دے گا۔''

تائی امی کا سر جھک گیا۔ ندامت کے احساس تلے چُور چُور ہو گئیں۔ جو باتیں منہل آج ان سے کہہ رہی تھی۔ یہ تو وہ ہمیشہ سے سمجھتی تھیں، جانتی تھیں۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''آپ نے اپنے بیٹے کی خود سے محبت آزمائی۔ وہ آپ کی خواہش کیا احترام میں اپنی زندگی سے ہی دستبردار ہو گئے۔ اب آپ انہیں زندہ کر دیں امی! اپنے بیٹے کو اس کی زندگی، ایک جیتی جاگتی زندگی لوٹا دیں۔ ہاں میں ان کی بیوی ہوں مگر میں ایک عورت بھی تو ہوں اور عورت کا ظرف ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ سمندر جتنی وسعت اور ظرف عطا کیا ہے قدرت نے عورت کو۔ آپ کے پاس بھی اتنا ہی وسیع ظرف ہے۔ اتنا ہی بڑا دل ہے۔ بس اس کی کھوج لگا لیجیے گا۔ بہت سی الجھنیں سلجھ جائیں گی۔''

☆☆☆

وقت کے پیمانے سے قطرہ قطرہ ٹپکتے دنوں نے اس گہرے گھاؤ پر ٹھنڈے پانی سے بھیگا پھایا رکھا تو تھا۔ پر کبھی کبھی کوئی یاد دل میں چٹکی بھرتی تو کچے زخم سے کھرنڈ اتر جاتا اور وہ کہیں کونے کھدرے میں منہ دے کر دل ہلکا کر لیتی۔ کیونکہ وہ امی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ زین کی آمد و رفت ختم نہیں مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔ روبیشہ البتہ اُس سے بات کرنے میں احتیاط ہی برتتی تھی۔ ان ہی دنوں اُس کا گھر ٹوٹنے کی خبر پورے خاندان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

امی نے زین سے تفصیلات تو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ افسوس ضرور کیا۔ مگر وہ کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔ رُبا وہاں نہیں تھی مگر اندر کمرے میں امی کی بات ضرور سن رہی تھی۔ اس کا گھر

ٹوٹنے کی خبر نے اسے کوئی خوشی نہیں دی تھی۔ اسے اپنے دل پر قابو رکھنا آچکا تھا۔ دل میں اب بھی اس کی محبت پورے دھڑلے سے دھرنا دیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے پانے کی خواہش دم نہیں مار سکتی تھی۔ بلال بیرونِ ملک جاچکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک مختصر سے میسج میں اسے خدا حافظ کہا تھا اور بس۔

یمنیٰ کی ڈلیوری کے دن نزدیک آگئے۔ بچے ٹوئنز تھے اس نے خاندان میں نہیں بتایا تھا۔ اس کے گھر آنے والی اس نئی خوشی کی تیاری نے امینہ بیگم اور روبیشہ کو صبغہ کی موت کے غم سے سنبھلنے میں بہت مدد دی۔ یمنیٰ نے بھی جان بوجھ کر انہیں اپنی تیاریوں میں مصروف کردیا تھا۔ اور یہ خوشی بہرحال کوئی چھوٹی بھی نہ تھی۔ وہ بہرحال کئی سالوں بعد بہت دعاؤں اور منتوں مرادوں سے ماں بننے جارہی تھی۔

بلال کے فون اور میسجز میں صبغہ والے واقعے اور پھر دوسرے ہی دن اس کی دائمی جدائی کے بعد بہت تیزی سے کمی آئی تھی۔ روبیشہ نے بھی نوٹس لینا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ بہرحال اس حادثے میں کسی حد تک اسے بھی قصوروار سمجھتی تھی۔ اس دن صبغہ کو تیز بخار تھا اور اسے زندگی میں کبھی کسی نے سختی سے چھوا تک نہ تھا۔ کجا کہ کسی مردانہ ہاتھ کا تھپڑ...... اس کی طبیعت جب ہی سے بگڑنا شروع ہوئی تھی اور روبیشہ کے دل میں جنم لیتا بلال نامی نرم گوشہ تبھی سے پتھر ہونا شروع ہوا۔

☆☆☆

وہ جنوری کی ایک سرد ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ جب تیسرے پہر اسپتال کے یخ بستہ کاریڈور میں اس کے لبوں پر دعائیں جاری تھیں۔ آپریشن تھیٹر سے نکلتی ڈاکٹر نے تفکر آمیز انداز میں انہیں دیکھا اور نزدیک آئی۔

''مبارک ہو ٹوئنز ہیں، بیٹیاں''

''میری بہن......؟'' وہ بے تابانہ بولی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں خدا کا شکر ہے لیکن بچیوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ دونوں بہت ویک ہیں۔ خاص طور پر ایک بچی کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔ پیدائش سے پہلے ہی اس کی بریتھنگ (تنفس) میں رکاوٹ آگئی تھی اور ہارٹ بیٹ میں بھی۔ آپ دعا کریں بس۔''

وہ بے دم انداز میں بینچ پر گرگئی۔

''اور کتنی آزمائش باقی ہے خدایا!''

امینہ بیگم کے لب بے آواز پھڑپھڑائے۔ انہیں لگا وقت الٹی چال چلنے لگا ہے۔ ان کی زندگی کے سخت ترین لمحات دوبارہ دہرائے جانے والے ہیں۔

چند گھنٹے گزرے تو یمنیٰ کو روم میں شفٹ کردیا گیا اور ایک کامنی، پھول سی بچی اس کی گود میں آگئی۔ گلابی روئی کے گالے جیسی۔

''دوسری ابھی نرسری میں ہے''

نرس بے تاثر انداز میں اطلاع دے کر چلتی بنی۔

زین، تائی امی کو لے کر فجر کے وقت پہنچا۔ یمنیٰ کے شوہر کو گھر بھیجا اور خود ٹھہر گیا۔ یمنیٰ کی ساس گو کہ ضعیف تھیں مگر اس وقت مستقل وہیں موجود رہ کر امی کا حوصلہ بڑھانے کا سبب بنی رہیں۔ روبیشہ نے ان کی تھکن کا خیال کرکے انہیں بھی بیٹے کے ساتھ روانہ کردیا۔

وہ ننھی منی فرشتہ سی جیتی جاگتی گڑیا کو دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔ اسے چوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انمول خوشی تھی اور چہرے پر بچکانہ شوق۔ عرصے بعد زین نے نظر بھر کر اسے دیکھا تھا۔

تبھی ایک وارڈ بوائے وہ منحوس خبر لے کر آیا۔ جس نے سب کے دلوں پر غم کی کہر جمادی۔ یمنیٰ بے اختیار ہوکر زاروقطار رونے لگی۔ زین نے فوراً اس کی سسرال اور شوہر کو خبر دی۔ روبیشہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اللہ نے ایک بار پھر صبغہ کو ان سے واپس لے لیا ہے۔ لیکن وہ کفر کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''چپ ہوجاؤ یمنیٰ۔ اور شکر ادا کرو ایک بیٹی زندہ سلامت تمہارے پاس موجود ہے۔ خدا کی مرضی میں چھپی مصلحتوں کو بھلا ہم جیسے نادان کیا

سمجھیں گے۔''

☆☆☆

''دیکھا...... دیکھا آپ نے؟'' آمنہ ریحان بری طرح خار کھائے بیٹھی تھیں۔

''وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔ جڑواں بیٹیاں ہوئی تھیں یمنیٰ کے یہاں...... ایک ہی بچ سکی۔'' ریحان سعدی خاموش تھے۔ وہ توہم پرستی کے سخت خلاف تھے مگر بیگم کو جھٹلانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔

''میں ابھی فون کرتی ہوں بلال کو۔ اب تو میں کسی طور اس لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی۔ بس ہو گیا فیصلہ۔'' وہ قطعی انداز میں بولتی اٹھ کر فون ملانے چل دیں۔

☆☆☆

کوسوں، میلوں، سمندروں پار کتابیں کھولے وہ اپنی سوچوں سے اکیلا ہی نبرد آزما تھا۔ لندن فلائی کرنے سے ایک دن پہلے اس نے شاہ نور کو اندھیرے میں ٹیرس پر روتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ اس کے جانے پر یوں چھپ چھپ کر آنسو بہائے۔ وہ حیرت زدہ انداز میں پوچھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

''تمہیں کسی کے آنسو نظر آتے ہیں حیرت ہے؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

وہ گنگ رہ گیا تھا۔ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''اور نظر آئیں بھی تو کیا۔ تم نے تو کر لی ناں اپنی خوشی پوری۔ اور اس کے پیچھے جو تین لوگ خوار ہوئے وہ؟ ہاں یقیناً تمہارے لیے تو تمہاری اس روبیشہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ پھر میں ہوں، ہانیہ یا دانیال...... کوئی ہنسے یا روئے، جیے یا مرے۔ تمہیں اس سے مطلب؟''

وہ پھٹ پڑی تھی۔ اور کب سے اپنے دل میں جمع شدہ غبار کو نکال کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

کئی مہینے پرانا ایک پریشان کن منظر بالکل کسی گرما گرم خبر کی طرح ابھی آنکھوں میں تازہ تھا۔ اس کے رنگ پھیکے نہ پڑے تھے۔ کہ ان رنگوں میں شاہ نور کے آنسو گھلنے لگے۔

''تم اتنے بے حس بھی ہو سکتے ہو بلال۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔''

بھلا وہ بے حس کب تھا جو شاہ نور نے ایسا کہا۔

''آپ کیوں نہیں آئے؟ میں نے رات میں کتنا بلایا۔'' روبیشہ کے لفظوں کی گونج، یہ اس کے احساسات ہی تو تھے۔ جنہوں نے جینا مشکل کر دیا تھا۔ ایک معمولی فقرے میں پوشیدہ جذبے اس پر ایک پل میں وا ہو گئے تھے۔ پھر بھلا وہ بے حس کہاں تھا۔

روتے ہوئے لہجے، ٹوٹے ہوئے مان کا مرثیہ پڑھتے الفاظ چابک کے مانند اس کی سماعتوں پر شائیں کر کے پڑتے اور وہ تکلیف سے سن ہو جاتا۔

دنوں پرانی باتیں یاد آتی جاتیں۔

''وہ جس نے زندگی میں کبھی تمہارے سوا کسی اور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ کیا کرے۔''

ایک عنکبوت اس کے گرد کس رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس میں پھنسنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''اب بتاؤ۔ کیا اب بھی تمہارا دل مانتا ہے یہ شادی کرنے کو؟'' آمنہ بیگم فون پر بلال کی برین واشنگ میں مصروف تھیں۔

''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں بیٹا!''

اس کی مسلسل خاموشی نے انہیں دھیما کر دیا۔

''تم خود سوچو، بے شک فیوچر کے بارے میں کسی انسان کو نہیں پتا۔ مگر جان بوجھ کر غلط فیصلہ کرنا تو کوئی عقل کی بات نہیں۔ ارے تم نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کی جڑواں بہن کو۔''

آمنہ بیزاری سے اسے بتا رہی تھیں۔

''بالکل ابنارمل لڑکی تھی وہ، خود سوچو، بھلا جس

خاندان میں اس طرح کے کیسز ان کی ماں کے زمانے سے چلے آ رہے ہوں تو۔ وہاں سے کون لڑکی لے گا۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔''

بلال کی خاموشی ان کا حوصلہ بھی بڑھا رہی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھیں۔

''اور وہ لڑکی روبیشہ...... وہ خود کون سا خوش تھی منگنی کے وقت...... ارے سارا خاندان جانتا ہے وہ اور زین انوالوڈ تھے ایک دوسرے کے ساتھ۔ زین کی بیوی بھی اسی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلی گئی اور......''

''امی پلیز......'' بہت دقت سے اس کے منہ سے نکلا۔

امی کو روانی سے بولتے بولتے بریک لگ گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ مگر ابھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ان لوگوں سے معذرت کرلوں گی۔ تم بیٹا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ ہانیہ کا سوچو۔ اس بیچاری کا اس معاملے میں کیا قصور ہے۔ وہ تو جب سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ مستقل بیمار رہنے لگی ہے بیٹا۔''

بلال نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

''تو پھر میں جاؤں ان لوگوں کی طرف؟ ابھی تو اتنے دن بھی نہیں گزرے۔''

''ٹھیک ہے امی! جو آپ کا دل کرے وہ کریں۔''

ایک گھنٹے امی کی بات سننے کے بعد صرف اتنا کہنے میں ہی اس کے اعصاب شل ہو گئے۔ بے انتہا دکھ اور غم کے دم گھوٹتے احساس کے ساتھ اس نے ریسیور رکھا اور بستر پر گر گیا۔

''مجھے مستقبل کی کوئی فکر تھی نہ اپنی اولاد کا کوئی خدشہ لیکن......لیکن......''

آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور تکیے میں منہ دے دیا۔

کبھی لوٹ آئیں تو نہ پوچھنا ہاں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

☆☆☆

خاندان کے دو گھروں میں ایک ہی شام اپنی ڈھیر ساری رونقوں سمیت اتری تھی۔ اور صداقت علی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس گھر میں رکیں اور کس کو نظر انداز کریں۔

روبیشہ اور ہانیہ دونوں ہی ان کی بیٹیاں تھیں۔ ان کا اپنا خون۔

بے شک وہ ایک لمبے عرصے تک روبیشہ کے وجود سے بے پروا اور غافل رہے۔ مگر صبغہ کی موت نے انہیں دیر سے ہی سہی مگر ان کے حقوق یاد دلا دیے تھے۔

وہ ایک ہی وقت میں دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے جا رہے تھے۔ خدا جانے اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی یا کیا...... مگر پورا دن گھر میں ہونے والی تقریب کے سلسلے میں وہ بے حد مصروف رہے۔ مغرب سے ذرا پہلے بمشکل وقت نکال کر جب اُدھر پہنچے تو وہاں بھی تمام انتظامات مکمل ہی تھے۔

زین بصد احترام ان سے ملا۔ تائی امی اور ان کی بڑی بیٹی جو خاص طور پر شہر سے باہر سے اس رسم کے لیے آئی تھی۔ دونوں کا ہی رویہ البتہ تھوڑا سرد سا تھا۔

صداقت علی کو آج یہی بات خوش کر رہی تھی کہ وہ روبیشہ کے نکاح میں سرپرست کی حیثیت سے شامل ہو رہے تھے۔ اور آج یہی بات انہیں افسردہ بھی کر رہی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اپنی پہلی بیوی اور بیٹیوں کے وجود سے کس قدر غافل تھے۔ بار بار ان کی آنکھیں چمکتیں اور وہ بار بار فخر سے ایک اڑتی پڑتی نگاہ زین پر ڈال کر دل میں اطمینان اور سکون کی لہریں اترتی محسوس کر رہے تھے۔

انہیں آج پوری طرح احساس ہو رہا تھا کہ آج اگر یہاں زین کے بجائے بلال بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اس نکاح میں شامل ہی نہ ہو پاتے۔ ہو بھی جاتے تو ان کی خوشی اور اطمینان کا یہ عالم نہ ہوتا۔

وہ کس طرح ایک بیٹی کا گھر بسانے کے لیے دوسری بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑتا ہوا دیکھتے۔

نکاح کے بعد مبارک سلامت کے معمولی سے تبادلے کے دوران انہوں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ روبیشہ کے

سر پر رکھا۔ پھر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا کر سسک پڑے۔

قسمت نے اس مقام پر اسے شکست دی تھی۔ جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چلا تھا۔ منگنی کے بجائے نکاح کی تقریب کا مشورہ شاید نہیں یقیناً بزرگوں نے مستقبل کی پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ تاکہ بلال آئندہ کسی اور کو اس نظر سے نہ دیکھ سکے۔ جس پر صرف اور صرف ہانیہ کا حق تھا۔

اس نے جگمگاتے ہوئے لان میں اِدھر سے اُدھر پھرتے ماں باپ، خالہ خالو، اپنی کزن کم منکوحہ..... بہن اور بہنوئی سب کے چہرے کھوج ڈالے۔ ہر چہرے پر چمک تھی، خوشی تھی۔ پالینے کا غرور تھا۔ سب لوگوں کے درمیان صرف ایک وہی تھا جو سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔

اس کے کانوں میں ہانیہ کے کھلکھلانے کی آواز آئی، شاہ نور ہنستے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

''میں نے اپنی بہن کے دل کی خوشی لوٹانے کے لیے اپنے دل کی خوشی کو لوٹا دیا تو کیا اب میں اتنا بھی نہیں کرسکتا کہ ان لوگوں کی خاطر تھوڑی سی ایکٹنگ ہی کرلوں۔ کیا پتا کبھی محبت میرے دل پر بھی ہانیہ کے نام کا صحیفہ رقم کر ہی دے۔'' کھلکھلاتی ہوئی شاہ نور اور ہانیہ..... چہکتا ہوا دانیال۔ اس کے امی، ابو، سب کس درجہ خوش، مطمئن اور شاد تھے۔

''شاید میں نے...... ان کی خوشی کی قیمت چکادی ہے اور یہ لوگ بھی مجھے کم عزیز تو نہیں پھر ملال کیسا۔''

یہ وہ پہاڑ سا مرحلہ تھا۔ جو اسے کسی کے علم میں لائے بغیر اکیلے ہی سر کرنا تھا۔

دل کو راہِ راست پر لانے میں کچھ وقت لگے گا
پاگل ہے اس کو سمجھانے میں کچھ وقت لگے گا

اس نے تشویش سے خود کو دیکھتی ماں کو دیکھا۔ جو اشارے سے فکر مندی سے ''کیا ہوا ہے؟'' پوچھ رہی تھیں۔

وہ بے وجہ ہی نرمی سے مسکرادیا۔

☆☆☆

اسے معلوم تھا زندگی اور وقت ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اس کے لیے بھی اپنے دامن میں خوشی اور طمانیت چھپائے فقط اسے انتظار کروا رہی ہے۔ اور وہ یہ انتظار ختم ہونے کی تحمل سے منتظر تھی۔ اس کے صبر اور خاموشی کا کیا انعام اسے ملنے والا تھا۔ اس بارے میں سوچنا بیوقوفی ہی تھی۔

منہل کی طرف سے ایک دن اچانک ہی خلع کا نوٹس موصول ہوا اور زین نے کسی اضافی جھنجٹ میں پڑے بغیر اس کی مشکل آسان کردی۔

''میرے دل میں کوئی افسوس نہیں، اس کے لیے۔ اس نے اپنے لیے بہتر فیصلہ کرلیا۔ وہ یقیناً اس سے کہیں اچھی زندگی گزارے گی جو میں اسے دیتا۔ ادھوری خوشیوں کے ساتھ یا مکمل دکھوں کی لپیٹ میں۔''

زین نے ہفتہ بھر پہلے ہی اسے تمام بات بتائی تھی اور صاف لفظوں میں یہ بھی کہ وہ اب مزید کسی انتظار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ تقدیر کے اس اچانک پلٹنے پر اس قدر حیران ہوئی کہ جیسے خوش ہونا ہی بھول گئی۔ بس ایک حیرانی سی حیرانی اسے اپنے حصار میں لیے رکھتی۔

''ہاں بس ایک خیال سا آتا ہے۔ اگر امی نے پہلے اتنی ضد نہ کی ہوتی تو شاید منہل میری زندگی میں آتی ہی نہ...... تب اس کا دل ٹوٹنے سے بچ جاتا اور ہم پہلے ہی مل چکے ہوتے۔'' زین کے گمبھیر لہجے میں یکا یک در آنے والا استحقاق، اس نے دل سے محسوس کیا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ٹھنڈک سی اتر آئی۔

ابا کے اندر آنے والی مثبت تبدیلی کی بڑی وجہ بھی شاید یہ رشتہ ہی تھا۔ ورنہ بلال جس طرح ان کی دوسری بیٹی کو ٹھکرا کر اسے اپنانے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھا تھا۔ اس سے بہت سارے لوگوں کے خواب بکھر جانے تھے۔

وہ نکاح والے دن لاشعوری طور پر صبح سے ابا کے آنے کی منتظر رہی۔ وہ بلاشبہ زندگی میں پہلی بار ان کا انتظار کررہی تھی اور انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا

تھا۔ جبھی نکاح کے بعد وہ جس طرح اسے لپٹا کر روئے، روبیشہ کا دل پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گرتے چلے گئے۔ وہ ننھی معصوم بچی کی طرح ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ سینے سے چمٹ گئی اور بلک پڑی۔

آج اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ اور وہ اس دن کوئی گلہ شکوہ دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ٹیرس کی طرف کھلنے والے دروازے سے جاتی سرما کی ٹھنڈا اور نم ہوا کے جھونکے جالی دار پردوں کے پیچھے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کے بیٹھا زین اور اس کے برابر میں بیٹھی وہ خود بزبانِ خاموشی محوِ گفتگو تھے۔

کتنے لمحے سرک چکے تھے۔ کتنے زمانے بیت گئے تھے۔ اس پر ایک عالمِ خود فراموشی طاری تھا۔ یوں جیسے وہ شام سے اب تک کسی خواب میں جی رہی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کی آواز تو کیا معمولی سی جنبش بھی اس خواب کو توڑنے کی قصوروار ٹھہر سکتی ہے۔

وہ دم سادھے بس خاموشی سے کمرے کی تزئین و آرائش کا جائزہ لیتی رہی۔ کمرا بے حد جلدی میں سنوارا گیا تھا مگر پھولوں سے بے تحاشا بھر دیا تھا۔ خوش رنگ گلابوں کی بہتات اور انڈلی خوشبو اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اس مدہوش کُن مہک کو اپنے اندر اتارا۔ جبھی زین نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”کوئی بات کرو رُبا۔“ اس کی آواز مدھم اور جذبوں سے معمور تھی۔

اس کی گرم مضبوط گرفت میں ربا کا نازک ہاتھ ایک عجیب استحقاق کے ساتھ دبا ہوا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں سمٹ سی گئی۔

”کیا بولوں، مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ایک بات بتاؤں تمہیں۔“ وہ اب سامنے کی اور دیکھتا دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

”مجھے اب تمہیں پانے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو شاید میں بہت زیادہ دن جی نہ پاتا۔“

روبیشہ دہل سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار محبت کا اظہار اور وہ بھی اتنے خطرناک انداز میں۔

”پھر تو شکر ہے ہم مل گئے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”ہوں۔“ زین نے ذرا سا ترچھا ہو کر شرارت سے اس کی شکل دیکھی۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ وہ پُرشوق گرم نگاہوں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”میں اور تم...... ایک نیا رشتہ...... اور یہ تنہائی۔“

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور ربا کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

”ظ...... ظاہر...... ر...... ہے اچھا۔“ وہ اٹک اٹک گئی۔

”ہوں۔“ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ میں دبے ربا کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

”اور اب......“ ربا نے بے بسی سے تھوک نگلا۔

زین کے انداز نرالے تھے۔ بولتی آنکھیں، مسکراتے لب اور دبی دبی شرارتیں۔ ربا کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔ دل الگ بغاوت پر آمادہ تھا۔ زین اس کی بے بسی سے محظوظ ہوتا رہا پھر وفورِ جذبات سے اپنا دایاں بازو پھیلا کر اسے خود سے لگا لیا۔

”ربا...... تم جان ہو میری۔“

روبیشہ جو اس کی قربت کی آنچ سے پگھلی جا رہی تھی اس خوبصورت اظہار پر اس کے من مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

تحفظ کے گہرے احساس کے ساتھ اس نے زین کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔